جلد ۵ شمارہ ۳
جولائی تا دسمبر ۲۰۱۲

چیلنج

ایڈیٹرز: صبیحہ حسن اور عذرا طلعت سعید

اٹھو کہ وقت آیا....

پچھلے کئی سالوں سے سامراجی قوتیں شدید مالی بحران کا سامنا کررہی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس بحران کی وجہ خود سرمایہ داری کا ''زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے لیے زیادہ سے زیادہ پیداوار'' کا گھن چکر ہے۔ سرمایہ داری اپنے نظام کی اس شدید کمزوری کا اعتراف کرنے کو بالکل تیار نہیں بلکہ اب اس کے شیطان صفت دماغ نے اپنے مالیاتی بحران کے حل کے لیے اپنے ہی پیدا کیے ہوئے ماحولیاتی بحران کا سہارا ڈھونڈ لیا ہے۔ اسی پس منظر میں سرمایہ داری نے اپنی معیشت کو سنبھالنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر سبز معیشت کا سحر تیسری دنیا کی حکومتوں پر طاری کرنے کی کوششیں شروع کردی ہیں۔ ایک طرف پاکستان کی سرکار اور مقامی سرمایہ کار اس سحر میں پھنسنے کو تیار ہیں تو دوسری طرف عوام جاگیرداری اور سرمایہ داری کے دیو ہیکل پہیوں میں پھنس کر بے حال ہے۔ غذائی اجناس کی قیمتوں میں دن بدن اضافہ اور تیل و ڈیزل کے روزانہ بڑھتے ہوئے دام، عوام کی اسی بے بسی کی عکاس ہیں۔ توانائی کے شعبے میں بحران اور سی این جی کی قلت کے ذریعے سرکار وہ میدان تیار کررہی ہے کہ عوام کو اس حوالے سے یہ باور کروایا جاسکے کہ توانائی حاصل کرنے کے لیے صرف امریکہ اور یورپ سے سبز معیشت پر مبنی توانائی پیدا کرنے کی ٹیکنالوجی حاصل کرنا ہی اس بحران سے نکلنے کا واحد راستہ ہے۔ یہی کچھ ہتھکنڈے شاید جینیاتی خوراک کی درآمد اور پیداوار کے لیے بھی استعمال ہونے والے ہیں۔ پاکستان پر امریکی سرکار کی 2012 زرعی بائیوٹیکنالوجی رپورٹ ایک واضح اشارہ ہے کہ آنے والے سالوں میں بین الاقوامی جینیاتی کمپنیاں بالخصوص امریکی کمپنیاں پاکستان میں بہت بڑے پیمانے پر جینیاتی فصلوں، بیجوں، جینیاتی جانوروں اور ڈیری شعبے میں اپنے عمل دخل کو بڑھانے کے کالے منصوبے بنارہی ہیں۔ اسی حوالے سے پاکستان میں غیر ملکیوں کے زمین پر قبضے کی خبریں تو آئے دن شائع ہورہی ہیں لیکن افسوس ناک عمل یہ ہے کہ ان سازشوں میں ہمارے ملک کی جاگیردار قوتیں ''پارلیمانی جمہوریت'' کو فروغ دیتے ہوئے ملک کی صوبائی و قومی اسمبلیوں پر قبضہ جمائے ہوئے ہیں۔ یہ اب زرعی پیداوار میں بیک وقت جاگیرداری کو مضبوط رکھتے ہوئے سرمایہ دار قوتوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کرکے استحصال اور ظلم کی نئی روایت قائم کر رہے ہیں۔ ان استحصالی قوتوں کے کردار پر اگر غور کرتے ہیں تو ان میں ایسے کئی عالمی ادارے بھی نظر آنا شروع ہوجاتے ہیں جو کہ اکثر سخت تنقید کے زاویوں سے بچے رہتے ہیں۔ ان میں اقوام متحدہ اصلاح پسندی کو ڈھال بنائے سرفہرست ہے۔ تنقیدی عوامی گروہوں کو اقوام متحدہ کے بہروپیہ کردار سمجھنے کے لیے زراعت، صحت اور مزدوروں سمیت کئی شعبوں کو کھنگالنے کی اشد ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر اقوام متحدہ کا خوراک و زراعت کا ادارہ خوراک کے تحفظ کا بڑھ چڑھ کر پرچار تو کرتا ہے لیکن ساتھ ساتھ جینیاتی بیجوں، فصلوں اور دیگر اشیاء کی پیداوار اور تجارت میں سامراجی قوتوں کے لیے ''منشی'' کا کردار ادا کرنے میں بھی پیش پیش ہے۔

سرمایہ داری نظام کے پیدا کیے گئے معاشی، موسمی اور غذائی بحران کا چیلنج اپنے پچھلے شماروں میں تفصیلی جائزہ پیش کرتا رہا ہے اور اب یہ شمارا سامراجی طاقتوں کے ساتھ ساتھ پاکستانی اشرافیہ کی چال باز پالیسیوں کی جھلک پیش کررہا ہے۔ اگر پاکستان کی عوام خاص کر کسان مزدور طبقے نے اپنے آپ کو منظّم کرتے ہوئے آگے بڑھ کر ان سامراجی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہ کیا تو ہم شاید غلامی کی زنجیروں میں جکڑتے چلے جائیں گے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس وقت امریکی سرکار مطمئن ہے کہ پاکستانی عوام اگر میر جعفر کا کردار ادا نہیں بھی کررہی تو کم از کم اس نئی طرز کی غلامی کے لیے رکاوٹ بننے کے لیے بھی تیار نہیں۔ یہ وہ وقت ہے کہ ہم تاریخ سے سیکھتے ہوئے سرمایہ داری، جاگیرداری نظام سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے منہ توڑ جواب دینے کو تیار ہوجائیں۔

فہرست مضامین

چال بازوں کا گٹھ جوڑ.................. 2
ریو پلس 20 تاریخی پس منظر............ 7
اقوام متحدہ کا کردار........................ 15
پاکستان میں جینیاتی زراعت............ 23
مونسانٹو کا بیج پر ذہنی ملکیت کا مقدمہ...... 33
جینیاتی فصلوں پر فلپائن سے 35
بات تو سچ ہے مگر...................... 37

چیلنج روٹس فار ایکوٹی (Roots for Equity) نے میزریور کے تعاون سے شائع کیا ہے۔
سیکرٹریٹ: اے۔1، فرسٹ فلور، بلاک 2، گلشن اقبال، کراچی
فون، فیکس: 0092 21 3481 3320 فیکس: 0092 21 3481 3321
ای میل: roots@super.net.pk

چال بازوں کا گٹھ جوڑ: سندھ، پاکستان میں زمینی قبضے کی ایک مثال*

تلخیص و ترجمہ: ارشاد سومرو

گزشتہ کئی برسوں سے عالمی سطح پر زمینی قبضے جیسے مسائل نے کافی توجہ حاصل کی ہے۔ کیمیائی طرز زراعت کے پیداواری طریقوں کے شدید استحصال سے لاکھوں لوگوں کا انسانی وقار بھوک اور غربت کے ذریعے مجروح کیا جارہا ہے۔ دوسری جانب اس کیمیائی طرز زراعت سے تنوع حیات اور قدرتی توازن میں بے انتہا بگاڑ پیدا ہونے کے ساتھ کئی طرح کے جانداروں کو خطرے میں ڈال کر ایک ہی قسم کی فصلوں کی تیز ترین پیداوار کی جارہی ہے۔ اس سے صرف اور صرف امیر ترین بین الاقوامی سرمایہ دار کمپنیوں کے سرمایہ میں اضافہ ہورہا ہے جن کی جڑیں سامراجی سرمایہ دار ممالک میں پائی جاتی ہیں۔

صنعتی طرز زراعت کا پیداواری نظام تمام شعبوں میں اپنی شاخیں پھیلا رہا ہے۔ اس سلسلے میں تازہ ترین پیش رفت کئی ممالک میں مختلف حوالوں سے زمین کے ٹھیکے حاصل کرنا بھی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ زمین حاصل کرنے والے ممالک اپنی آبادیوں کے لیے خوراک کا تحفظ چاہتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ ان کے مقاصد میں خوراک و زراعت کی پیداوار میں سرمایہ کاری کے ذریعے منافع حاصل کرنا بھی شامل ہے۔ زمین ٹھیکے پر لینے میں کئی ممالک کی حکومتیں بھی شامل ہیں تاکہ وہ اپنے ممالک کی کثیر آبادیوں کے لیے خوراک کا تحفظ حاصل کرسکیں۔ اس تمام عمل میں زمین دینے اور لینے والے کے درمیان کسی قسم کا تعاون نہیں پایا جاتا اور فریقین کے درمیان صرف سامراجیت کا رشتہ رہتا ہے۔

پاکستان بھی بڑے پیمانے پر زمینی قبضے کا سامنا کررہا ہے۔ مثال کے طور پر تھائی لینڈ کی کئی کمپنیوں پر مشتمل ایک گروپ چیرون پوک فنڈ (Charoen Pokphand/CP) نے حکومت پنجاب کے ساتھ معاہدہ کیا ہے۔ اسی طرح متحدہ عرب امارات نے بھی حکومت پنجاب سندھ اور بلوچستان کے ساتھ 324,000 ہیکٹر زمین پر زرعی سرمایہ کاری کے معاہدے کیے ہیں۔ پاکستان میں اس طرح کی سرمایہ کاری کے اقدامات کو رپورٹ تو کیا جاتا ہے لیکن ان اقدامات کے حوالے سے علمی یا عوامی اداروں کی طرف سے تحقیق یا عوامی مہم جوئی کی ابتدا ابھی تک نہیں ہوئی جو کہ آبادیوں پر مرتب ہونے والے اثرات کی حقیقی عکاسی کرسکے۔ لہذا اوپر بیان کیے گئے خدشات کو مدنظر رکھتے ہوئے روٹس فار ایکوٹی نے پیسٹی سائیڈ ایکشن نیٹ ورک ایشیاء اور پیسفک (Pesticide Action Network, Asia and Pacific) کے ساتھ مل کر پاکستان میں زمینی اجارہ داری پر تحقیقی کام کی شروعات سندھ کے ضلع میر پور خاص میں متحدہ عرب امارات کی زرعی کمپنی الدہرا سے کی ہے جس کے اغراض و مقاصد مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ زمین کی موجودہ ملکیت اور مقامی آبادیوں کا زمین و دیگر قدرتی وسائل پر حق کا جانچنا۔

2۔ حالات اور واقعات کو بیان کرنا جن کے ذریعے زمین پر اجارہ داری قائم کرتے ہوئے زمین مقامی آبادیوں سے حاصل کی گئی۔

3۔ زمین پر اجارہ داری سے مقامی آبادیوں پر اثرات کی نشاندہی۔

4۔ زمین پر اجارہ داری کے خلاف مقامی آبادیوں یا ان کی نمائندہ جماعتوں کے طرف سے مزاحمت کا اندازہ لگانا۔

پاکستان میں الدہرا کی شروعات

الدہرا ایک نجی زرعی کمپنی ہے جو کہ خوراک اور مویشیوں کے کاروبار میں سرمایہ کاری کرتی ہے۔ کمپنی کی بنیاد 1995 میں متحدہ عرب امارات میں رکھی گئی۔ پیداوار اور منافع کی وسعت کی خاطر کمپنی نے دنیا کے بیشتر ممالک میں ایک بلین درہم (272.2 ملین ڈالرز) کی سرمایہ کاری کے ذریعے، امریکہ، یورپی یونین، مصر، اسپین اور پاکستان میں الفا الفا (alfa alfa) اور رہوڈس (rhodes) گھاس کی پیداوار کے لیے ہزاروں ہیکٹرز زمین لے رکھی ہے۔

پاکستان میں الدہرا نے اپنے منصوبے کی شروعات 2007 میں سندھ کے ضلع میر پور خاص سے کی جس کے لیے سندھ کے صوبائی زرعی وزیر سید علی نواز شاہ کی ذاتی زمین کو لیز پر لیا گیا۔ پاکستان کی زرعی معیشت جاگیرداری نظام کے تسلط میں ہے اور جاگیردار اس ملک کے پارلیمانی نظام کا حصہ بھی ہیں۔ جاگیردار طاقتور ہونے کی بنا پر اپنے مفادات کی خاطر ملکی قوانین میں رد و بدل کرکے بیرونی سرمایہ کاروں کے ساتھ ساز باز کرکے بڑے پیمانے پر منافع کمانے کے لیے زمین کے معاہدے کرتے ہیں۔ اسی طرح اپنے عہدے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سندھ کے صوبائی وزیر سید علی نواز شاہ نے الدہرا زرعی کمپنی سے 3,200 ایکڑ زرعی زمین کا معاہدہ کیا ہے۔ سید علی نواز شاہ سیاستدان ہونے کے ساتھ جاگیردار اور شوگر مل کے مالک بھی ہیں۔ مقامی لوگوں کے مطابق زمین کا معاہدہ 25,000 روپے فی ایکڑ سالانہ پانچ سال کے لیے طے پایا ہے۔ جس میں زمین کی تمام انتظام کاری غیر ملکیوں کے ہاتھ میں دی گئی ہے۔ اس سے پہلے یہ معاہدہ پانچ سال کے لیے 10 ہزار روپے فی ایکڑ پر کیا گیا تھا۔

معلومات اکٹھا کرنے کے دوران الدہرا کے سپروائزر نے تحقیقی ٹیم کو بتایا

کہ کمپنی نے 3,200 ایکڑ زمین پر صرف 60-50 افراد کو ملازمت دے رکھی ہے جن میں مزدور کی کم سے کم اجرت 8,000 روپے تک ہے لیکن مقامی آبادیوں کے مطابق الدہرا کے کھیت مزدوروں کو ماہانہ 6,500 روپے اجرت دی جاتی ہے۔ مزدوروں کے مطابق انہیں پورے ہفتے میں کوئی چھٹی نہیں ملتی اگر کسی مجبوری کی صورت میں چھٹی کر لی جائے تو تنخواہ سے پیسے کاٹ لیے جاتے ہیں۔

الدہرا کو دی گئی زمین کا رقبہ دو مختلف گاؤں سید خادم علی شاہ اور سید علی نواز شاہ میں واقع ہے۔ شروعات میں 14 سے 15 مزدور ایک واٹر کورس پر کام کرتے تھے لیکن اب مزدوروں کی تعداد کم کرکے پانچ سے چھ کر دی گئی ہے۔ ان کھیت مزدوروں کے کام میں زمین کو پانی دینا، بنے سیدھے کرنا، نالوں اور کھالوں کو اندر اور باہر سے صاف کرنا، گھاس نکالنا اور یوریا کا چھڑ دینا شامل ہے۔

پیداوار اور ترسیل

الفا الفا اور رہوڈس گھاس کی کاشت اور پیداوار کا تمام کام خودکار مشینری کے ذریعے سرانجام دیا جاتا ہے جس میں بیج کی بوائی، گھاس کی کٹائی، گھاس کو جمع کرنے سے لے کر مشین کے ذریعے گھاس کے گٹھے بنانے جیسے کام شامل ہوتے ہیں۔ گھاس کے گٹھوں کو لوڈر مشینوں کے ذریعے اٹھا کر کنٹینروں میں ڈالا جاتا ہے جو کے کراچی پورٹ سے دبئی بھیجے جاتے ہیں۔

گھاس کی بیج آسٹریلیا سے درآمد کی گئی ہے جس کو مقامی لوگ برو گھاس کہتے ہیں۔ گھاس کے حوالے سے لوگوں میں یہ گمان ہے کہ عربی لوگ یہ گھاس اپنے اونٹوں کے لیے پیدا کر رہے ہیں لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ 3,200 ایکڑ پر پیدا کی جانے والی گھاس صرف اونٹوں کے لیے تو نہیں ہوسکتی۔ اس گھاس سے شاید دیگر اشیاء بھی تیار کی جاتی ہیں۔ الدہرا کے مزدور اور مقامی لوگوں کے مطابق گھاس کی تیاری میں بے تحاشہ پانی استعمال کیا جارہا ہے۔ اس سلسلے میں پکے واٹر کورس بنانے کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹا کینال بھی حکومت سندھ سے منظور کروایا گیا ہے۔

زمین حاصل کرنے کے ہتھکنڈے

گاؤں سید خادم علی شاہ کے 150 گھروں پر مشتمل میگھواڑ برادری کے لوگ نسلوں سے سید قطب علی شاہ کی زمینوں پر بطور ہاری کام کرتے چلے آرہے ہیں۔ بات چیت کے دوران مقامی لوگوں نے تحقیقاتی ٹیم کو بتایا کہ وہ اپنے مرشد سید قطب علی شاہ سے بہت مطمئن تھے کیونکہ وہ بہت شفیق اور مددگار انسان تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کی تمام زمین ان کی اکلوتی بیٹی کو وراثت میں مل گئی۔ بیٹی کی شادی کے بعد زمین کی دیکھ بھال قطب علی شاہ کے داماد نے سنبھال لی، جس نے اپنے نئے منشی کے ذریعے زمینوں پر کام کرنے والے ہاریوں کا استحصال شروع کردیا۔ مقامی لوگوں نے بتایا کہ ہاریوں کو پیداوار کا کم حصہ ملتا تھا جس سے وہ قرض میں ڈوبتے چلے گئے۔

ان تمام حالات سے تنگ آ کر قطب علی شاہ کے ہاریوں نے آہستہ آہستہ زمینوں پر کام کرنا چھوڑ دیا اور روزگار کے دیگر ذرائع مثلاً درزی، بڑھی، مکینک، دیہاڑی اور بھٹہ مزدوری جیسے کام کرنا شروع کردیے۔ وہ زمین جس پر کبھی یہ آبادیاں اپنی خوراک کی پیداوار کرتی تھیں کافی عرصے تک بنجر پڑی رہی جس کے دو تین سالوں کے بعد زمین الدہرا کمپنی کو دی گئی۔ یہ مقامی آبادیاں کئی نسلوں سے اس زمین پر کام کرتی رہی تھیں جن کو سیدھی طرح ہٹانے کی بجائے اس طرح بے دخل کیا گیا کہ زمیندار پر کوئی الزام نہ آئے۔

مقامی آبادی نے تحقیقاتی ٹیم کو بتایا کہ ایک دن انہیں اچانک بڑی بڑی مشینوں کی آواز سنائی دی جو زمین کی تیاری کررہی تھیں۔ تب انہیں معلوم ہوا کہ یہ زمین عربیوں کو 10 سال کے لیے ٹھیکے پر دی گئی ہے۔ مقامی لوگوں کا کہنا تھا کہ پہلے تو انہیں اس زمین سے اپنے مویشیوں کے لیے تھوڑا بہت چارہ مل جاتا تھا لیکن اب وہ یہاں سے گھر کی چار دیواری کی باڑ تک کے لیے بھی ایک ڈھنگری (کانٹے دار جھاڑی) نہیں لے سکتے۔

ذریعہ معاش

ضلع میر پور خاص کی 80 فیصد مزدور آبادی کا روزگار زراعت سے جڑا ہوا ہے۔ سال 2011 کی بارشوں نے ضلع بھر میں فصلوں کو تباہ کردیا۔ تحقیقاتی ٹیم سے بات کرتے ہوئے لوگوں نے بتایا کہ پچھلے سال ضلع میں بے روزگاری اتنی بڑھ گئی کہ لوگوں کو اپنا پیٹ پالنے کے لیے اپنے مویشی بھی بیچنے پڑے۔ ایک کسان کے مطابق اس کو اپنی دو بکریاں نہایت سستے داموں یعنی 2,000 روپے میں بیچنا پڑیں کیونکہ اس کے پاس اپنے خاندان کے لیے خوراک حاصل کرنے کا اور کوئی طریقہ نہیں تھا۔ ایک ہاری نے بتاتے ہوئے کہا کہ ''وہ لوگ دیگر گاؤں میں زمین پر کام بطور ہاری کرسکتے ہیں لیکن پھر بھی وہ شہروں میں کام یا کھلی مزدوری کو ترجیح دیتے ہیں، استحصال کی وجہ سے زمین کا کام نہیں کرتے۔ پورا سال صبح سے لے کر شام تک سردی گرمی میں کام کرتے رہتے ہیں اور جب فصل کاٹنے کے بعد حصہ لینے کا مرحلہ آتا ہے تو زمیندار کھاد، پانی، ٹریکٹر، بیج، زہریلی ادویات کی مد میں ان کے حصے کا اناج بھی واپس لے لیتا ہے۔ اس طرح پورے سال محنت کرنے کے بعد بھی ہم خالی ہاتھ رہتے ہیں۔ اس لیے شہروں میں کھلی مزدوری ہی ہمارے لیے مناسب روزگار ہے''۔

دیہاڑی کی مزدوری کی صورتحال کے حوالے سے ایک بھٹہ مزدور نے بتایا کہ ''اس علاقے میں کئی زمیندار ہیں جو کہ سید خاندان کے رشتے دار ہیں جو مزدوروں کو بہت کم اجرت پر کام دیتے ہیں۔ ہمارے پاس ان کے کام کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے کیونکہ بے روزگاری بہت بڑھ گئی ہے۔ ہر کوئی کم سے کم اجرت پر کام کرنے کے لیے راضی ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر میں 250 روپے دیہاڑی مانگتا ہوں تو دوسرہ بندا 200 روپے دیہاڑی پر راضی ہوجاتا ہے''۔

ایک مزدور نے بتایا کہ اس کے گھر کے دیگر افراد بھی مزدوری کا کام کرتے ہیں۔ 2011 کی بارشوں میں اس کے جو مویشی مرگئے وہ اس کی آمدنی کا ذریعہ تھے جن سے چار سے پانچ کلو دودھ روزانہ نزدیک کے ہوٹل پر فروخت کرتا تھا اور تھوڑے بہت پیسے ملتے تھے اس سے وہ آٹا لیتا تھا۔ اس کے گھر والے گندم کی کٹائی کرتے تھے۔ ایک ایکڑ گندم کی کٹائی سے چار، پانچ من گندم مل جاتی تھی۔

اسی طرح ایک عورت نے بتایا کہ ہمارے علاقے میں ہر گھر کا ایک مرد دیہاڑی پر مزدوری کرنے کے لیے شہر جاکر 300 روپے یومیہ دیہاڑی کماتا ہے لیکن اس میں سے 100 روپے آنے جانے کا کرایہ لگ جاتا ہے جبکہ باقی 200 روپے روزانہ کے سودے میں خرچ ہوجاتے ہیں۔ گاؤں سید خادم علی شاہ میں ایک نوجوان نے تحقیقاتی ٹیم کو اپنے حالات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ ''ہم 250-200 روپے سے دیگر ضروریات یعنی شادی، بیاہ، فوتگی، صحت، تعلیم جیسے مسائل کو کس طرح حل کریں۔ تمام ضروریات کے لیے ہمیں اپنے مویشی فروخت کرنے پڑتے ہیں''۔ اس علاقے میں جہاں الدہرا نے زمین لے رکھی ہے وہاں پر مقامی لوگوں کے روزگار کے لیے نہ کسی قسم کی کوئی تدابیر کی جارہی ہیں اور نہ ہی کمپنی مقامی لوگوں کو روزگار دے رہی ہے۔ ان آبادیوں کے زیادہ تر نوجوان آم کے موسم میں باغات میں مزدوری کرتے ہیں اور تین سے چار ہزار روپے ماہانہ کماتے ہیں۔

ایک عورت نے بتایا کہ ''ہمارے یہاں گھروں میں مویشیوں کے لیے گھاس کافی زیادہ ہوتی تھی لیکن اب مویشیوں کے پالنے کے لیے گھاس بھی دور دراز سے لانی پڑتی ہے۔ جب کبھی ہمارے ہاں پیسے ہوتے ہیں ہم پیٹ بھر کے کھاتے ہیں اور جب کم ہوتے ہیں تو کم کھاتے ہیں۔ پہلے ہم لسی، مکھن، دہی اور دودھ وغیرہ اپنے مویشیوں سے حاصل کرتے تھے اور ان کو گھاس چرانے کے لیے باہر زمینوں پر بھی لے کر جاتے تھے۔ لیکن جب سے الدہرا کمپنی کو زمین دی گئی ہے یہ سب ختم ہوگیا ہے''۔

تحفظ خوراک پر اثرات

صوبہ سندھ کے اکثر و بیشتر علاقوں میں ایک ایکڑ زمین سے اوسطاً 30 من گندم کی پیداوار حاصل کی جاتی ہے۔ اس طرح الدہرا کو دی گئی 3,200 ایکڑ زمین سے 96,000 من گندم حاصل کی جاسکتی ہے۔ لیکن اب الدہرا کو زمین لیز پر دینے کے بعد ایسا ممکن نہیں رہا۔ ان زمینوں پر مقامی آبادیاں گندم، مرچی، کپاس اور دیگر فصلوں کی کاشت کرتے تھے پر اب انھی آبادیوں کو سبزی اور آٹا بھی اپنی روزانہ کی مزدوری سے خریدنا پڑتا ہے جن کے دام آئے دن بڑھ جاتے ہیں۔

تحقیقاتی ٹیم گاؤں میں ہی تھی کہ خبر آئی کہ آٹے کی قیمت 32 روپے سے 36 روپے کردی گئی ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ یہ خبر ان آبادیوں کے لیے کسی بجلی کے جھٹکے سے کم نہیں تھی۔ دیہی آبادیوں میں چھ، سات افراد پر مشتمل ایک خاندان میں تین، چار کلو آٹا روزانہ استعمال ہوتا ہے۔ آلو یا ترکاری کا استعمال مقدار میں بہت کم ہوتا ہے اس لیے بھوک اصل میں روٹی کھا کر مٹائی جاتی ہے۔ اس خبر کے تکلیف دہ ہونے میں اس لیے اتنی حیرت کی بات نہیں۔ اگر خاندان کے ایک ہی فرد کو مشکل سے کام ملتا ہے اور جب کہ ماہانہ مزدوری 6,500 روپے سے زیادہ نہیں تو آٹے کی فی کلو چار روپے قیمت بڑھنا بھی زیادہ ہے کیونکہ 100 سے 130 روپے روزانہ کا صرف آٹا خریدنے میں خرچ ہوتے ہیں۔ جس دن شہر میں مزدوری لگتی ہے اس دن پانچ کلو آٹا خریدتے ہیں اور جس دن کام نہیں ملتا اس دن دو کلو سے گزارا کرنا پڑتا ہے۔

ان پسی ہوئی آبادیوں کو صرف روزانہ کی خوراک کے حصول کے لیے سخت محنت کرنی پڑتی ہے۔ خوراک کی ضرورت پورا کرنے کے لیے گندم کی کٹائی کے موسم میں کسان آبادیوں کے افراد دیگر زمینداروں کی زمینوں پر بھی گندم کی کٹائی کرتے ہیں۔ عام طور سے ایک ایکڑ گندم کی کٹائی پر تین من گندم مزدوری دی جاتی ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ دیہی آبادیاں ملک کے لیے خوراک کی پیداوار کرتی ہیں لیکن اپنے خاندان کو خوراک نہیں مہیا کرپاتیں۔ یہاں تک کہ چارے کی وجہ سے ان کے مویشی بھی کم ہوگئے ہیں کیونکہ انہیں کھلانے کے لیے ان کے پاس گھاس نہیں۔ ان آبادیوں کے لیے مویشی وہ واحد ذریعہ تھے جن سے وہ اپنی خوراک کے لیے دودھ، دہی، لسی اور مکھن وغیرہ حاصل کرتے تھے یا ان چیزوں کو بیچ کر اپنے گھر کے اخراجات پورے کرتے تھے لیکن الدہرا کو زمین دینے کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہوگیا ہے۔ ایک عورت کے مطابق اس کے بیٹے کو الدہرا کی زمین سے گھاس کاٹنے کے الزام میں پولیس سے گرفتار کروا دیا گیا۔ عورت کا کہنا تھا کہ ''ہمیں اپنے بچے مویشیوں سے پیارے ہیں''۔

پانی پر اثرات

نہر کے آخری حصے میں مقیم آبادیوں کو پانی کی کمی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ الدہرا کی زمین کے لیے بے تحاشہ پانی چوری کیا جاتا ہے۔ کمپنی نے پانی اٹھانے کے لیے بڑی بڑی موٹر مشینیں لگا رکھی ہیں۔ الدہرا کے پانی کی چوری سے نزدیک کی زمینوں پر نہ صرف خوراک کی فصلوں میں کمی واقع ہوئی ہے بلکہ گھاس کی پیداوار بھی کم ہوگئی ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ الدہرا کی زمین کے لیے حکومت سندھ سے ایک واٹر چینل کی منظوری لی گئی ہے اور اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس منظوری میں زرعی وزیر علی نواز شاہ کی افسر شاہی طاقت کا اثر بھی ضرور ہوگا۔ ان کے ڈر سے پانی کی چوری کے خلاف مقامی آبادیاں اور چھوٹے کاشتکار آواز بھی نہیں اٹھا رہے۔

دیہی ترقی

رہوڈس گھاس کی پیداوار گاؤں سید علی نواز شاہ، خاصخیلی گوٹھ، جمعہ گوٹھ، ماچھی گوٹھ اور گاؤں سید خادم علی شاہ میں کی جارہی ہے جہاں پر زیادہ تر آبادیاں ہندو میگھواڑ اور

کولہی برادری پر مشتمل ہیں۔ ان کے زیادہ تر مکان مٹی اور لکڑیوں سے بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کچھ گھر پکے بھی ہیں۔ گاؤں میں نکاسی کا نظام انتہائی خراب ہے۔ صحت کی سہولت نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس گاؤں میں لڑکیوں کے لیے مڈل اسکول، لڑکوں کے لیے ہائی اسکول، صحت کے مرکز اور جانوروں کا ایک سرکاری ہسپتال بھی نظر آیا لیکن مقامی لوگوں کے مطابق اسکول اور ہسپتال میں کوئی ملازم ڈیوٹی پر نہیں آتا۔

نقل مقانی

الدہرا کو زمین لیز پر دینے کے بعد درجنوں خاندان روزی کی تلاش میں دیگر شہروں ٹنڈو آدم، ٹنڈو الھیار، سامارو یا ڈگھری وغیرہ کی طرف نقل مقانی کر گئے ہیں۔ ایک کسان کا کہنا تھا کہ ''ہمیں ڈر ہے کہ اگر الدہرا نے زمین مانگی تو ممکن ہے کہ ہمیں یہاں سے بھی بے دخل کیا جائے گا کیونکہ پیسے کی لالچ میں زمیندار کچھ بھی کرسکتا ہے''۔ زمین سے بے دخلی کے خوف کی وجہ سے ایک عورت نے صاف بتاتے ہوئے کہا کہ ''ہم اپنے حقوق کے بارے میں نہیں بول سکتے۔ فرض کریں اگر بول بھی دیں تو وہ ہمیں ہمارے گھروں سے کھینچ کر بے دخل کردیں گے تو پھر ہم کہاں جائیں گے کیونکہ ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں کہ ہم میر پور خاص شہر میں رہائش کے اخراجات کو برداشت کرسکیں''۔ بے زمینی کی ایک اور مثال دیتے ہوئے ایک کسان نے بتایا کہ ''اس علاقے میں میگھواڑ برادری کا ایک گاؤں تھا جو مین روڈ پر لغاری پیٹرول پمپ کے ساتھ کئی سالوں سے آباد تھا لیکن زمینداروں نے وہ گاؤں خالی کروا لیا کیونکہ اس گاؤں کی زمین پر بنگلے بنانے کے لیے پلاٹ فروخت کیے جا رہے تھے''۔ گاؤں کے لوگوں نے مزید بتایا کہ ''150-100 خاندان نقل مقانی کر گئے ہیں کیونکہ وہ صرف کاشتکاری جانتے تھے۔ اب چونکہ زمین الدھرا کو دی گئی ہے لہذا ان کا روزگار بھی یہاں سے ختم ہوگیا ہے''۔

عورتوں پر اثرات

عام طور پر عورتیں کپاس اور مرچ کی چنائی، بینگن، پیاز کی بوائی، کٹائی اور صفائی وغیرہ جیسے کام کرتی ہیں لیکن وہ علاقے جہاں الدہرا نے زمین لے رکھی ہے وہاں کی مقامی عورتوں کے لیے روزگار کے یہ مواقع بھی ختم ہوچکے ہیں۔ ایک عورت نے بتاتے ہوئے کہا کہ ''پیاز کی بوائی میں صرف 100 روپے دیہاڑی ملتی ہے جبکہ صبح سات سے شام پانچ بجے تک کپاس کی چنائی کے لیے 200 روپے فی من ملتا ہے لیکن ایک دن میں ہم صرف 10 سے 20 کلو کپاس کی چنائی کر پاتے ہیں۔ اسی طرح پیاز کی کٹائی، صفائی اور ڈیڑھ من بوری کی بھرائی کے صرف 70 روپے ملتے ہیں''۔

سید خاندان کی طرف سے استحصال کی کہانی ایک عورت نے بتائی کہ ''ایک دفعہ عورتوں نے تین دن تک کھیتوں میں مرچ کی چنائی کی لیکن اس کام کی اجرت نہیں دی گئی''۔ اگر کوئی خاندان کسی زمیندار کے پاس ہاری کے طور پر کام کرتا ہے تو کپاس کی فصل میں اس کے گھر کی عورتوں کو مفت میں کپاس کی چنائی کرنی پڑتی ہے۔

میر پور خاص میں زمینی قبضے کے اثرات اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ ہر خاندان میں ایک کمانے والے پر گھر کے تقریباً 10 افراد کا انحصار ہوتا ہے۔ ایک مسلمان عورت کے مطابق ''بھیل اور میگھواڑ برادری کی عورتوں کو دور دراز علاقوں میں کام مل جاتا ہے کیونکہ ان کے رابطے ہوتے ہیں لیکن مسلمان عورتوں کو اس طرح رابطے کی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے کام نہیں ملتا''۔ ایک اور عورت نے کہا کہ ''ہم لوگ روزگار کی تنگی کی شکایت بھی نہیں کرسکتے۔ جب کبھی بھی وزیر علی نواز شاہ آتے ہیں تو وہ بہت لوگوں کے ساتھ ہوتے ہیں جو کہ ہم سے ملنا بھی پسند نہیں کرتے تو پھر ہم کس سے شکایت کریں''۔

ماحول پر اثرات

الدہرا کی لیز کردہ زمین پر رہوڈس گھاس کی پیداوار کے لیے کیمیائی کھاد کا بے تحاشہ استعمال کیا جاتا ہے۔ الدہرا کے مزدوروں کے مطابق ایک ایکڑ زمین پر گھاس کی پیداوار کے لیے کیمیائی کھاد کی چار بوریاں استعمال ہوتی ہیں۔ 3,200 ایکڑ زمین پر ہرموسم میں 12,800 بوریاں استعمال کی جاتی ہیں۔ وہاں کی مقامی آبادیاں کھاد کے کیمیائی اثرات سے بالکل ناواقف تھیں۔

مزاحمت

زمین پر قبضے کی وجہ سے مقامی کسانوں کی زمین سے بے دخلی اور روزگار پر اثرات کے خلاف مزاحمت کے حوالے سے بات کرتے ہوئے نوجوان مزدور نے اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''ہمارے لوگوں نے تو دو، تین سال پہلے ہی اس زمین پر کام کرنا چھوڑ دیا تھا اور اگر ہم زمیندار علی نواز شاہ کو کہتے ہیں کہ الدھرا کو زمین نہ دو تو وہ یقینی طور پر ہمیں کہتا کہ کیا تم لوگ وہ پیسے دے سکتے ہو جو الدہرا سے مل رہے ہیں؟''۔ ایک اور بوڑھے مقامی کا کہنا تھا کہ ''سچ بات تو یہ ہے کہ ہم اس وقت سید خاندان کے بہت شکر گزار ہیں جو انہوں نے ہمیں رہنے کے لیے تھوڑی سی زمین دے رکھی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمیں یہاں سے کوئی نہیں ہٹا سکتا ہم یہاں بہت محفوظ ماحول میں ہیں''۔ لوگوں سے بات چیت کے دوران اس بات پر سب سے زیادہ زور دیا جارہا تھا کہ انہیں سید علی نواز شاہ سے کوئی تکلیف نہیں وہ اپنے مرشد سے بہت خوش ہیں۔

اگر دیکھا جائے تو سندھ میں عموماً اقلیتوں کی تکلیفوں میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہا ہے کیونکہ وہ خود کو بہت زیادہ غیر محفوظ سمجھتے ہوئے حالات سے سمجھوتا کررہے ہیں۔ مزاحمت کے حوالے سے وہ الدھرا کو کبھی نہیں کہیں گے کہ وہ زمین خالی کرے کیونکہ ایسا کرنے سے وہ لوگ گھروں سے بے دخل کردیے جائیں گے۔ گاؤں سید خادم علی شاہ کے ایک میگھواڑ کسان نے بتایا کہ ہماری میگھواڑ بستی کے تقریباً 250

ووٹ ہیں جو ہم اپنے مرشد کو دیتے ہیں۔

نیولبرل ازم نے زراعت میں پیداواری اخراجات کو ایک طرف بے تحاشہ بڑھاوا دیا ہے تو دوسری طرف مشینی زراعت میں مسلسل اضافے نے روزگار میں بھی کمی کردی ہے۔ اشرافیہ طبقے کی دولت میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ یہ دولت جاگیردار قوت اور افسر شاہی سیاست کے میل سے مزید مضبوط ہوجاتی ہے۔ اس طرح اس گٹھ جوڑ کو غریب کے لیے توڑنا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔

سندھ کے ضلع میر پور خاص میں زمینی قبضہ کی تحقیق سے مقامی سیاسی قوتوں اور سامراجی سرمایہ کار طبقات کی دھوکے بازی واضح نظر آتی ہے۔ دیہی آبادیوں کی بے دخلی زمین کے قبضے سے پہلے ہی بہت زیادہ تھی لیکن اس نئی صورت حال میں ان کے حالات مزید خراب ہوگئے ہیں۔ ان آبادیوں کو اب انتہائی بھوک کا سامنا ہے۔ تحقیق کے دوران اکثر دیکھنے میں آیا کہ مسلمان آبادیاں پھر بھی کچھ نہ کچھ بولنے کی جرات رکھتی ہیں ان کے برعکس ہندو برادری اپنے جاگیرداروں کے لیے صرف اچھے الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ دیہی آبادیاں شہروں میں رہائش اور مہنگائی کے اخراجات سے خوب واقف ہیں کیونکہ دیہات میں نہ تو گھر کا کرایہ دینا پڑتا ہے اور نہ ہی گیس، بجلی اور پانی کے ماہانہ اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ انہیں اس بات کی بھی سمجھ ہے کہ اگر وہ حقوق کی جدوجہد میں شامل ہوں گے تو انہیں اور ان کے خاندان والوں کو نہ صرف گھروں سے بے دخلی کا سامنا کرنا پڑے گا بلکہ ان کو مجرم بھی قرار دیا جائے گا۔ یہ وہ خدشات ہیں جن کے خوف کی وجہ سے یہ دیہی کسان آبادیاں خصوصاً اقلیتی آبادیاں اپنے اوپر کیے گئے مظالم کے خلاف مزاحمت کرنے سے ڈرتی ہیں۔ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ دیہاتی افراد کے پاس شہروں میں مہیا روزگار کے لیے ہنر نہیں ہوتا۔

گو کہ یہ سارے خدشات بالکل حقیقت پر مبنی ہیں لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان ہی پسے ہوئے طبقات کے حالات اور زندگی میں تبدیلی، صرف اور صرف چھوٹے اور بے زمین کسانوں کی مزاحمتی تحریکوں کے ذریعے ہی آ سکتی ہے۔

* Roots for Equity Of Collusions and Collaborations: A Case of Land Grab in Sindh, Pakistan. PAN AP, 2012, accessed from http://www.panap.net/sites/default/files/casestudy-sindh-land-grabbing.pdf

پینل کا مشورہ - بی ٹی فصلوں کی آزمائشی کاشت پر دس سالہ التوا*

نئی دہلی

ترجمہ: سعید احمد

عدالت عظمیٰ کے احکامات پر تشکیل دیے گئے سائنسدانوں کے پینل نے جینیاتی تبدیلی کی حامل تمام بی ٹی غذا کی فصلوں کی آزمائشی کاشت پر دس سالہ قانونی پابندی (moratorium) کی صلاح دی ہے۔ خوراک کے حوالے سے ان فصلوں کے محفوظ ہونے کے معیار کی جانچ پڑتال خاص کر بی ٹی کپاس اور بی ٹی بیگن کے اعداد وشمار پر نظر ثانی کرنے کے بعد، تکنیکی ماہرین کے چھ رکنی پینل نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ جینیاتی تبدیلی کی حامل فصلوں کی آزمائشی کاشت پر پابندی کے حوالے سے ارونا راڈریگس (Aruna Rodrigues) اور دیگر افراد کی جانب سے دائر کردہ درخواست کی سماعت کے دوران عدالت عظمیٰ نے وزارت ماحولیات کو پینل کے تقرر کی ہدایت کی تھی۔ پینل نے متفقہ طور پر اس وقت تک قانونی پابندی کا مشورہ دیا ہے جب تک آزمائشی کاشت (field trials) کے لیے مخصوص جگہوں کا تعین اور منظوری نہ ہوجائے اور اس عمل کے مشاہدے کے لیے مکمل طریقہ کار ترتیب نہ دے دیا جائے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ جینیاتی تبدیلی کی حامل فصلوں کے حوالے سے حیاتیاتی تحفظ کا علم رکھنے والے سائنس دانوں کا ایک پینل ان امور کی جانچ اور تجزیہ کرے۔ انہوں نے مشورہ دیا ہے کہ آزمائشی کاشت سے قبل ابتدائی حیاتیاتی تحفظ (biosafety tests) کی جانچ کو یقینی بنایا جائے اور چھوٹے جانوروں میں زہریلے مادے کے ضرر رساں یا نقصاندہ اثرات کا پتہ چلایا جائے۔

صحت، ماحولیات اور سماجی معیشت کے دیگر امور پر ابھرتی ہوئی تشویش کو مدنظر رکھتے ہوئے پینل نے اپنی عبوری رپورٹ میں جڑی بوٹی مار زہر برداشت کرنے والی فصلوں کی آزمائشی کاشت پر قانونی پابندی لگانے کا مشورہ دیا ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ''یہ قانونی پابندی اس وقت تک رہنی چاہیے جب تک ماہرین اور اس معاملے میں شمولیت رکھنے والے افراد پر مشتمل ایک آزاد کمیٹی جڑی بوٹی مار زہر برداشت کرنے کی ٹیکنالوجی اور ہندوستان میں اس کی موزونیت کا جائزہ نہ لے لے''۔

ہندوستان کارٹیجینا پروٹوکول (Cartagena Protocol) پر دستخط کرچکا ہے جس میں ماحولیاتی تنوع حیات کی اہمیت کو ایک طویل المدت سرمائے کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ اس پس منظر میں پینل نے جینیاتی ردوبدل سے تیار کردہ ان فصلوں کی آزمائشی کاشت پر پابندی لگانے کی صلاح دی ہے جن کی نشو ونما یا تنوع کا مرکز (centre of origin or diversity) ہندوستان ہے کیونکہ یہ جینیاتی پودے حیاتیاتی تنوع میں بگاڑ یا برے اثرات کے حامل ہو سکتے ہیں۔ پینل کا کہنا ہے کہ ماہر سائنس دانوں کو حیاتیاتی تحفظ (biosafety) کے حوالے سے تمام مواد (data) جو کہ ابھی زیر غور ہے کی از سر نو جانچ کرنی چاہیے۔ ساتھ ہی ان فصلوں پر بھی نظر ثانی کرنی چاہیے جن کے استعمال کی منظوری دی جاچکی ہے۔ پینل واضح کرتا ہے کہ یہ اقدام لازمی ہیں، کیونکہ ''تکنیکی ماہرین کی کمیٹی کے سامنے کئی معاملات آئے ہیں جن میں تحفظ سے متعلق دستاویزات میں مشکوک پہلوؤں کو نظر انداز کردیا گیا ہے''، لہذا کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ دوبارہ جانچ، ''اگر ضروری سمجھا جائے تو وسیع تجربے کے حامل بین الاقوامی ماہرین کے ذریعے کروائی جائے''۔ یہ بھی مشورہ دیا گیا ان تمام مصنوعات (جینیاتی) چاہے ان کی منظوری دی جاچکی ہو یا ابھی وہ منظوری کے مراحل میں ہوں کی جانچ کے لیے کترنے والے چھوٹے جانوروں (rodents) پر طویل المدت (longterm) اور بین النسلی (inter-generational) تجربات کیے جائیں۔

یہ پینل ممتاز سائنس دانوں پر مشتمل تھا:

عمران صدیقی، نباتاتی نشو ونما کے سائنس داں اور خلیاتی و مالیکیولی حیاتیات کے مرکز، حیدرآباد کے سربراہ؛ پی ایس راما کرشن، پروفیسر ایمریٹس (emiritus) ماحولیاتی علوم اور ماحولیاتی تنوع، جواہر لال نہرو یونیوسٹی، دہلی؛ پی سی چوہان، غذائی تحفظ اور جینیاتی مضر اثرات کے ماہر؛ پی سی کیسا وان، سابق جی اے آر سی سائنس داں، جینیاتی مضر اثرات کے ماہر اور تابکار حیاتیات میں ڈسٹیوینگشٹ (distinguished) فیلو، ایم ایس سوامی ناتھن ریسرچ فاونڈیشن، چنائے؛ بی سیوا کمار، سابق ڈائریکٹر نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف نیوٹریشن، حیدرآباد؛ مئی میں پینل کی تشکیل کے اعلان کے بعد چھٹے ممبر نے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔

* The Times of India. "Expert panel recommends 10-year moratorium on GM food crop field trials", October 19, 2012, accessed from http://articles.timesofindia.indiatimes.com/2012-10-19/india/34583110_1_field-trials-aruna-rodrigues-ngo-gene-campaign

ریو پلس 20 تاریخی پس منظر

(دوسری قسط)

تحریر: صبیحہ حسن

موسمی تبدیلی کے واحد معاہدے - کیوٹو پروٹوکول (Kyoto Protocol) - میں 2005 تک جو تبدیلیاں ہوئیں اس کا جائزہ آپ پچھلے شمارے میں پڑھ چکے ہیں۔ اقوام متحدہ کے فریم ورک کنونشن برائے موسمی تبدیلی (United Nations Framework Convention on Climate Change /UNFCCC) کے تحت کانفرنس آف پارٹیز (Conference of Parties) کو سالانہ منعقد کیا جاتا ہے اور اکثر صرف کوپ (COP) کے نام سے ہی جانا جاتا ہے۔ پہلا کوپ 1995 میں برلین، جرمنی میں منعقد ہوا۔ 2012 تک 18 کوپ ہو چکے ہیں۔ ان کانفرنسوں میں سے کچھ کا ذکر یہاں ضروری ہے۔

2۔ کوپ 13، 2007

کیوٹو پروٹوکول کے 2005 میں نافذ ہونے کے بعد 2012 تک ترقی یافتہ ممالک کو کاربن کے اخراج میں لازمی کمی لانی تھی۔ کیوٹو کے بعد 2007 میں UNFCCC (یو این ایف سی سی) کے تحت انڈونیشیاء کے شہر بالی میں دو ورکنگ گروپس تشکیل دیے گئے۔ ایک کی توجہ لمبی مدت کے اقدامات پر مرکوز تھی اور دوسرا گروپ کیوٹو کے بعد کے عرصے میں کاربن کے اخراج میں فوری کمی کی بات کر رہا تھا۔ دو سال کے عرصے میں ان دونوں گروپوں کو کوپن ہیگن، ڈنمارک، میں 2009 موسمی تبدیلی پر اگلی کانفرنس کوپ 15 میں اپنی سفارشات پیش کرنی تھیں۔ اس بات چیت میں ترقی پذیر ممالک چاہتے تھے کہ ترقی یافتہ ممالک کاربن اخراج میں زیادتی کی اپنی تاریخی ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے بڑے پیمانے پر اخراج میں لازماً کمی کریں۔ انہیں اپنے کاربن اخراج میں 1990 کی سطح سے 2020 تک 40 فیصد کمی لانی تھی۔[1] ترقی پذیر ممالک پر کیوٹو پروٹوکول میں کاربن اخراج میں کمی کی کوئی پابندی نہیں تھی لیکن موسمی تبدیلی کے اثرات کے نمٹنے کے لیے وہ امداد کی فراہمی اور متبادل ٹیکنالوجی کی منتقلی بغیر ذہنی ملکیت کے حقوق (آئی پی آر)✡ چاہتے تھے۔ ترقی یافتہ ممالک اپنی تاریخی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہ تھے اور کاربن کے اخراج میں کمی کے لیے کسی پابندی کو اپنے اوپر عائد نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان ممالک کی تیل اور کوئلے کی کمپنیاں خاص طور سے کسی قسم کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہ تھیں۔ جولائی 2009 میں ترقی یافتہ جی-8 (G-8) ممالک کے اجلاس میں یہ بات سامنے لائی گئی کہ عالمی حدت یعنی درجہ حرارت (global warming) کو دو ڈگری سینٹی گریڈ سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ اس سلسلے میں ان کا یہ کہنا تھا کہ 2050 تک کاربن اخراج میں 50 فیصد تک کمی لائی جائے گی۔ وہ اخراج میں 80 فیصد تک کمی لانے کو بھی تیار تھے لیکن:

- اس عرصے سے پہلے کاربن اخراج کم کرنے کی کوئی درمیانی مدت انہیں قابل قبول نہیں۔
- وہ چاہتے تھے کہ ترقی پذیر ممالک جو اب ترقی میں بہت آگے بڑھ گئے ہیں مثلاً ہندوستان اور چین بھی کاربن کے اخراج میں کمی لائیں (حالانکہ ان ممالک پر نہ کوئی تاریخی ذمہ داری عائد ہوسکتی ہے اور نہ ہی فی کس اخراج میں یہ ترقی یافتہ ممالک کے قریب ہیں)۔
- ترقی یافتہ ممالک 2050 تک کے کاربن اخراج میں کمی کو بھی زیادہ تر مارکیٹ طریقہ کار سے اور کاربن ٹریڈنگ (carbon trading) سے کم کرنا چاہتے تھے، اپنے ممالک میں کاربن اخراج میں کمی لا کے نہیں۔
- وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ نجی شعبہ اپنے منافع اور آئی پی آر کے تحت موسمی تبدیلی کے امور انجام دے۔ اس کام میں سہولت کے لیے خود عالمی بینک اپنے کلائمٹ انوسٹمنٹ فنڈ (Climate Investment Fund) کے ذریعے ترقی پذیر ممالک میں کاربن اخراج میں کمی اور متبادل ٹیکنالوجی کو متعارف کرانے کے لیے سرمایہ فراہم کرنے پر راضی تھا۔

موسمی تبدیلی کے بین الاقوامی پینل (International Panel on Climate Change/IPCC) کے مطابق 2020 تک کاربن کے اخراج میں 1990 کی سطح سے 25-40 فیصد تک کمی ہونی چاہیے اور 2050 تک کمی 80-95 فیصد ہو۔ اگر درجہ حرارت کو دو ڈگری سینٹی گریڈ سے زیادہ بڑھنے سے روکنا ہے تو فضاء میں گرین ہاؤس گیسیز (greenhouse gases) کے اخراج کو 450 پی پی ایم (ppm) تک محدود رکھنا ہوگا۔ لہٰذا ترقی پذیر ممالک 2020 تک 40 فیصد اخراج میں کمی کا تقاضہ کر رہے تھے۔ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل بان کی مون (Ban Kee Moon) نے بھی G-8 کی طرف سے اخراج میں قابل ذکر کمی نہ کرنے اور 2020 تک کی درمیانی مدت میں کسی بھی پابندی کو قبول کرنے سے انکار پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ درمیانی مدت کے ہدف کا تعین ''سیاسی اور اخلاقی طور پر نہایت ضروری ذمہ داری ہے''۔

3۔ کوپ 15، 2009

کوپن ہیگن، ڈنمارک سے پہلے یہ امید کی جارہی تھی کہ سائنسی برادری کی طرف سے درجہ حرارت کے معاشی، معاشرتی اور اخلاقی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے نتیجہ میں ترقی

یافتہ ممالک خود اس کا اثر قبول کرتے ہوئے اپنے اختیار کیے گئے موقف میں تبدیلی لائیں گے۔ لیکن ہوا کیا؟ ورکنگ گروپس جو لمبی اور مختصر مدت کے لیے انڈونیشیاء کے شہر بالی میں قائم ہوئے تھے نے دو سالوں (2007-09) میں کی گئی بحث و مباحثے کے نتیجے میں اپنی سفارشات کوپ 15 میں مزید بات چیت کے لیے سامنے رکھیں تا کہ کسی عمومی سمجھوتے پر پہنچا جا سکے لیکن کوپن ہیگن میں اس سمجھوتے پر پہنچنے میں تاخیر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امریکہ، برطانیہ اور میزبان ملک ڈنمارک نے کیوٹو کے معاہدے کو پس پشت ڈالتے ہوئے اپنے لائحہ عمل پر کام شروع کر دیا جس کے تحت ترقی یافتہ ممالک کو یہ اجازت تھی کہ وہ کاربن اخراج کے حوالے سے:

- خود اپنے اہداف اور کاربن کے اخراج میں کمی کے ٹائم ٹیبل طے کریں۔
- کاربن مارکیٹ کے فروغ کے لیے کام کریں۔
- ماحول خصوصاً جنگلات وغیرہ کے لیے اپنے اصول وضع کریں۔
- نئی سبز ٹیکنالوجی ذہنی ملکیت کے تحفظ کے ساتھ ترقی پذیر ممالک میں متعارف کرائیں۔

ان نکات پر مشتمل خفیہ مسودے، جسے یو این ایف سی سی سی کے دائرے کے باہر تیار کیا گیا، کے راز کو خاموشی سے فاش کرنے کی بھی کوشش ہوئی۔ اس بے اطمینانی کی صورت حال میں دوسرے ممالک جن میں برازیل، جنوبی افریقہ، ہندوستان اور چین جو بیسک (BASIC) ممالک ہیں اور چھوٹے جزیروں کی ریاستوں کے اتحاد (Alliance of Small Island States /AOSIS) نے اپنے اپنے لحاظ سے الگ الگ مسودے مرتب کرنا شروع کر دیے۔ آخری دن امریکہ اور بیسک ممالک نے ایک اور مسودے پر اتفاق کیا جس پر 192 ممالک میں سے صرف 25 ممالک نے غور و خوض کیا۔ اسی مسودے کو پھر تمام ممالک کے سامنے مشترکہ مسودے یا کوپن ہیگن ایکارڈ (Copenhagen Accord) کے طور پر پیش کیا گیا۔ ترقی پزیر ممالک کی اکثریت کی طرف سے اعتراضات کی وجہ سے اس کانفرنس نے کوپن ہیگن ایکارڈ کو منظور نہیں کیا بلکہ یہ طے ہوا کہ یو این ایف سی سی سی کے تحت قائم ہوئے دو ورکنگ گروپس کی مدت بڑھا کر ان کے مسودوں اور کوپن ہیگن ایکارڈ دونوں کو آئندہ بات چیت کی بنیاد بنایا جائے۔ اس بات چیت کا سلسلہ 2010 میں کوپ 16، میکسیکو کے شہر کینکون (Cancun) میں شروع ہونا تھا۔

کوپن ہیگن ایکارڈ کے مسودے میں یہ بات تسلیم کی گئی تھی کہ درجہ حرارت کو دو ڈگری سینٹی گریڈ سے بڑھنے سے روکنا ہے مگر جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، اس میں ترقی یافتہ ممالک کو کسی طرح پابند نہیں کیا گیا۔ کاربن کے اخراج کے حوالے سے ہر ملک اپنے اہداف خود طے کرنے کے لیے آزاد تھا۔ ترقی یافتہ ممالک نے نہ صرف اپنے آپ پر تاریخی ذمہ داری کے حوالے سے کسی پابندی سے انکار کیا بلکہ موسمی تبدیلی کے معاملات میں یو این ایف سی سی سی کی مرکزی حیثیت کو بھی ختم کرنے کی کوشش کی جبکہ ترقی پذیر ممالک نے یو این ایف سی سی سی کے مرکزی حیثیت کو قائم رکھنے پر اصرار کیا۔ کوپن ہیگن ایکارڈ منوانے کے لیے ترقی یافتہ ممالک نے ترقی پذیر ممالک کے اتحاد کو توڑنے کے لیے ان ممالک کو اپنی امداد بند کرنے کی دھمکی بھی دی۔

جولائی 2010 تک یہ پالیسی رنگ لانے لگی اور 137 ممالک نے کوپن ہیگن ایکارڈ سے اپنے آپ کو جوڑنا شروع کر دیا۔ کچھ ممالک جن میں گروپ آف 77، چین، افریقی گروپ، غریب ترین ممالک کا گروپ اور AOSIS (اے او ایس آئی ایس) شامل ہیں نے اپنی الگ الگ سفارشات بھی رکھنی شروع کیں۔ تقریباً 107 ممالک نے موسمی نقصانات کے مدنظر یہ مطالبہ بھی کیا کہ دو ڈگری سینٹی گریڈ کے بجائے 1.5 ڈگری سینٹی گریڈ سے زیادہ گلوبل وارمنگ کو نہیں بڑھنا چاہیے اور اس مقصد کے لیے ترقی یافتہ ممالک کا اپنے ملکوں کے اندر کاربن اخراج کو کم کرنا بہت ضروری سمجھا گیا۔[2]

عوامی آواز

کوپن ہیگن میں منعقد کی گئی کوپ 15 سے پہلے ہی موسمی تبدیلی کے نتیجے میں ابھرنے والی عوامی تحریکوں نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ ان میں جنوبی ممالک کے چھوٹے کسانوں اور مقامی لوگوں کی تحریکیں شامل ہیں جنھوں نے ان نکات پر زور دینا شروع کیا کہ موسمی تبدیلی کی وجہ سے قدرتی وسائل، خوراک کی پیداوار اور مال مویشی وغیرہ کا بڑے پیمانے پر نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ مسائل حل نہیں ہوں گے جب تک ترقی یافتہ ممالک کا پیداواری نظام اپنی ضرورت سے زیادہ پیداوار کی وجہ سے کرہ ارض کے وسائل پر اپنا بوجھ بڑھاتا رہے گا۔ حل انصاف پر مبنی پائیدار ترقی میں ہے۔ اس حوالے سے ترقی کو عوامی فلاح کے لیے ہونا چاہیے نا کہ عالمی اشرافیہ کے عیش و آرام اور بین الاقوامی کارپوریشنوں کی نہ ختم ہونے والی ہوس کے لیے۔

اپریل 2010 میں کوپ 15 کے بعد بولیویہ (Bolivia) کے شہر کوچا بامبا (Cochabamba) میں موسمی تبدیلی کے مسئلے پر عالمی عوامی کانفرنس اور ہماری زمین (ماں) کے حقوق کے جھنڈے تلے مختلف عوامی تحریکوں اور مقامی لوگوں کے 35,000 نمائندے اکٹھا ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ حکومتیں موسمی تبدیلی کے مسئلے کا غلط حل پیش کر رہی ہیں۔ ہمیں قدرت کے ساتھ ہم آہنگی میں جینا سیکھنا ہے کیونکہ زمین اب اپنے آپ کو سنبھالنے کی صلاحیت سے 30 فیصد آگے جا چکی ہے۔ لہٰذا موسم پر بات چیت کو کاربن اخراج میں کمی تک محدود نہیں رکھنا چاہیے بلکہ:

- ترقی یافتہ ممالک اپنے اپنے ملکوں کے اندر کاربن کے اخراج کو 1990 کی سطح سے 50 فیصد تک کم کریں کیونکہ کاربن ٹریڈنگ ترقی یافتہ ممالک کے اندر زیادہ کاربن اخراج کو فروغ دے رہی ہے۔
- ترقی یافتہ ممالک کی طرف سے موسمی تبدیلی کے کسی بھی فنڈ یا امداد کو ان ممالک کی جی ڈی پی (GDP) کے چھ فیصد تک بڑھا دینا چاہیے اور یہ امداد یو این ایف

سی سی سی کے ذریعے ہو عالمی بینک کے تحت نہیں۔

- کسانوں اور مقامی آبادیوں کے زمین اور جنگلات پر حقوق کو موسمی تبدیلی کے نام پر کسی بھی منصوبوں میں پامال نہیں ہونا چاہیے اور تمام منصوبوں کو عوام کی رائے اور رضا کے بغیر آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔
- ملکوں کے درمیان مختلف شعبوں کے حوالے سے معاشرتی طور پر مناسب سبز ٹیکنالوجی کی منتقلی (بغیر آئی پی آر کے) اور اس ٹیکنالوجی کو مشترکہ بنیادوں پر چلایا جائے۔
- جو لوگ موسمی تبدیلی سے متاثر ہوکر نقل مکانی پر مجبور ہو رہے ہیں ترقی یافتہ ممالک ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری لیں۔
- موسمی تبدیلی کا غلط حل جیسے بائیو فیول، جیو انجینئرنگ[3] وغیرہ کو پوری طرح مسترد کیا جائے۔ اسی طرح ایگرو کیمیکل یا جینیاتی حل بھی قابل قبول نہیں۔
- کسانوں اور زراعت پر موسمی تبدیلی کے بدترین اثرات کو دیکھتے ہوئے صنعتی زراعت کے ماڈل کے بجائے پائیدار زراعت جس میں زمین کی صحت، حیاتیاتی تنوع، خوراک کے ذرائع میں تنوع، جنگلات پر مقامی لوگوں کا اختیار اور مقامی منڈیوں پر توجہ ہونی چاہیے۔

مندرجہ بالا مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے عالمی عوامی کانفرنس نے کینکون میں متبادل عالمی فورم برائے زندگی، ماحول اور معاشرتی انصاف (Alternative Global Forum for Life and Environmental and Social Justice) قائم کرنے کا ارادہ کیا۔

4۔ کوپ 16، 2010 اور کوپ 17، 2011

میکسیکو کے شہر کینکون میں 11 دسمبر، 2010 کو آدھی رات کے بعد کوپ 16 میں دو ہفتے کی بات چیت کے نتیجے میں اور بولیویہ کی شدید مخالفت کے باوجود 190 ممالک بالآخر اس کوشش میں کامیاب ہوگئے کہ ''کاربن کے اخراج میں کمی کا سب سے بہتر طریقہ کیا ہو؟''۔ کوپن ہیگن کی نااتفاقی کے بعد غریب اور امیر ممالک اس بات پر راضی ہوگئے کہ ''تمام ممالک کو سب سے پہلے کاربن کے اخراج میں کمی کرنی ہے''۔[4]

بولیویہ کی حکومت نے معاہدے کو ''اجتماعی قتل (genocide)'' کے مترادف قرار دیا، کیونکہ اس میں کاربن اخراج میں کمی بڑھتی ہوئی گلوبل وارمنگ کو روکنے کے لیے بہت کم ہے۔ میکسیکو کے صدر فلپ کیڈ لیرون (Felipe Cadleron) نے کہا کہ بولیویہ کے علاوہ تمام ممالک کے اشتراک نے اس معاہدے کو ''تاریخی'' بنادیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہ معاہدہ موسمی تبدیلی کے حوالے سے اقوام متحدہ کے طریقہ کار کو تقویت دے گا۔ اگرچہ یہ معاہدہ باقاعدہ عالمی دستاویز نہیں لیکن یہ تمام ممالک پر درجہ حرارت دو ڈگری سینٹی گریڈ سے زائد بڑھنے سے روکنے کی ذمہ داری عائد کرکے تاریخی کہلایا۔ امیر ممالک کیوٹو پروٹوکول کو توسیع دینے پر راضی تھے اور غریب ممالک نے پہلی دفعہ اپنے اوپر بھی کاربن کے اخراج میں کمی کی ذمہ داری عائد کی۔ موسمی تبدیلی کے معاملات سے نمٹنے اور جنگلات کے خاتمے کو روکنے کے لیے ''گرین کلائمٹ فنڈ (Green Climate Fund)'' کی ضرورت پر بات ہوئی۔[5]

کوپ 16 کے اتحاد اور اتفاق کو بڑھانے کا کام دسمبر، 2011 میں جنوبی افریقہ کے شہر ڈربن میں کوپ 17 نے کیا۔ اس کانفرنس آف پاٹیز کے بعد اقوام متحدہ کے انوائرنمنٹ پروگرام (UNEP) کے ڈائریکٹر اَخم اسٹائنر (Achim Steiner) نے کہا کہ ''ڈربن سے ہمیں گلوبل کلائمٹ ایکشن (Global Climate Action) کے حوالے سے حوصلہ ملا ہے۔ ممالک اب اکٹھا ہوکر موسمی تبدیلی کے مسئلے پر کام کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات معاشی سوچ بچار کرنے والوں، سرمایہ داروں اور سرمایہ کاروں کو مستقبل میں کم کاربن والی معیشت کے حوالے سے واضح اشارہ ہے''۔[6] یہ بات بھی سامنے لائی گئی کہ 2020 کے بعد کاربن اخراج کم کرنے کی قیمت چار گناہ زیادہ ہوجائے گی اور یہ کہ اگر موجودہ کاربن اخراج کی سطح کو کم نہ کیا گیا تو عالمی درجہ حرارت میں اس صدی کے آخر تک 3.5 ڈگری سینٹی گریڈ سے بھی زیادہ اضافہ ہوسکتا ہے۔

کوپ 17 میں یہ بھی بتایا گیا کہ بہت سے یورپی اور دیگر ممالک کیوٹو پروٹوکول کو 2012 کے بعد تک توسیع دینے کو تیار ہیں اگر دوسرے بڑے اخراج کرنے والے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک 2015 سے پہلے قانونی طور سے نافذ العمل نئے عالمی معاہدے، جس میں بڑے پیمانے پر کاربن اخراج میں کمی ممکن ہو، پر بات چیت پر راضی ہوں۔ کیوٹو پروٹوکول کے اس عالمی معاہدے تک برقرار رہنے کا مطلب ہے کہ اس میں شامل ''لچکدار طریقہ کار'' (جس کا ذکر پہلی قسط میں کیا گیا ہے) سے 2015 تک ترقی یافتہ ممالک فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔

ڈربن میں ٹیکنالوجی فائنانس (Technology Financing) یعنی ٹیکنالوجی مہیا کرنے کے لیے سرمایہ اور جنگلات کے خاتمے اور تباہی کے حوالے سے کچھ مخصوص فیصلے بھی ہوئے جس میں گرین کلائمٹ فنڈ کے لیے عملی اقدامات اور ترقی پذیر ممالک کو 2020 تک 100 بلین ڈالر تک کی امداد دینے کے معاملے بھی شامل ہیں لیکن ان کے لیے ترقی پذیر ممالک کو کچھ تیاریاں کرنی تھیں۔ ڈربن میں اس حوالے سے اڈپٹیشن کمیٹی (adaptation committee) یعنی موسمی تبدیلی کے حوالے سے اپنے آپ کو تبدیل اور سنبھال سکنے پر کام کے حوالے سے کمیٹی قائم کرنے کے ساتھ ساتھ کلائمٹ ٹیکنالوجی سینٹر اور نیٹ ورک کے قیام پر بھی تبادلہ خیال ہوا۔ کینکون سے ڈربن تک کی گرم جوشی اور اتفاق کے پیچھے جو چیز کارفرما تھی اور جس میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری ہوچکی تھی کا بھی ذکر اب ضروری ہے۔

سبز معیشت

مندرجہ بالا اتفاق اور گرم جوشی کے پیچھے سبز معیشت (Green Economy) کی سیاست چھپی نظر آتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک خاص کرکے یورپی ملکوں کا یہ وہ دھارا ہے

جو موسمی تبدیلی اور پائیدار ترقی کی بحث کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اگر موسمی تبدیلی کے حوالے سے ہماری منزل پائیدار ترقی ہے تو سبز کاروبار یا معیشت کو اس کا راستہ بنایا جارہا ہے۔ یہ کام 1992 کی ریو سمٹ (Rio Summit) سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ 1989 میں ایک کتاب ''سبز معیشت کا بنیادی خاکہ'' (Blue print for a Green Economy) نے اس کے بنیادی نقوش ابھارے۔ پھر یورپ سے ماحول دوست متبادل ٹیکنالوجی کے ذریعے یہ کام شروع ہوا۔ اس کے بعد امریکہ میں جیو انجینئرنگ کے شعبوں کو فروغ ملا۔ 2007 میں G8+5 (یعنی کینیڈا، فرانس، جرمنی، اٹلی، جاپان، روس، یو کے اور امریکہ کے علاوہ برازیل، چین، ہندوستان، میکسیکو اور جنوبی افریقہ) کی وزارتی میٹنگ میں یہ طے ہوا کہ ڈویش (Deutsche) بینک کے اعلیٰ افسر پاون سوکھ دیو (Pavan Sukhdev) کی نگرانی میں ماحولیاتی تباہی اور سبز متبادل کا حساب نقد پیسے سے لگانے کے لیے ایک کلیدی کام شروع کیا جائے۔ اس ٹیم نے 2008 میں اپنے کام کا پہلا حصہ ''قدرتی نظام اور ماحولیاتی تنوع کی معیشت'' (The Economics of Ecosystems and Biodiversity) کے عنوان سے UNEP (یو این ای پی) اور کنونشن برائے حیاتیاتی تنوع (Convention on Biodiversity) بون، جرمنی میں منعقد کی گئی میٹنگ کے دوران پیش کیا۔[7] پانچ مہینے بعد جب دنیا خوراک، توانائی اور معاشی بحران میں گرفتار ہو چکی تھی تو یو این ای پی نے گرین ایکانومی اینیشی ایٹوز (Green Economy Initiatives) کا اعلان کیا جس میں کلین (صاف) ٹیکنالوجی اور قدرتی وسائل جیسے جنگلات اور زمین وغیرہ میں سرمایہ کاری کی ترغیب دلائی گئی اور کہا گیا کہ اس سے ملازمت کے نئے مواقع پیدا ہوں گے۔ فروری 2011 میں جب ریو پلس 20 کا ایجنڈا تیار ہو رہا تھا یو این ای پی کی ٹیم نے ''گرین ایکانومی رپورٹ'' (Green Economy Report) پیش کی۔ یہ رپورٹ ایک تفصیلی دستاویز ہے جو بتاتی ہے کہ عالمی معیشت، تمام ممالک اور مقامی لوگ کیسے ''سبز'' ہو سکتے ہیں۔ زیر زمین ایندھن پر مبنی براؤن معیشت سے سبز معیشت کی طرف جانے کے لیے مندرجہ ذیل طریقہ اپنایا گیا ہے:

1۔ ماحول اور اس کے وسائل کی خدمات (services) کی قدر کا حساب نقد سے لگایا جائے۔

2۔ پائیداری اور منافع کے لحاظ سے قدرتی سرمائے اور اس سے جڑی نئی ٹیکنالوجیوں (small foot print technologies) کو آگے بڑھنے کا نیا ذریعہ (engine of growth) سمجھتے ہوئے اس میں سرمایہ کاری کی سفارش کی گئی۔ اسمال فٹ پرنٹ ٹیکنالوجیاں ایسی ٹیکنالوجیاں ہیں جو قریب قریب یا مقامی علاقوں سے حاصل بھی کی جائیں اور لاگو بھی کی جائیں۔

3۔ کہا گیا کہ نئی سرمایہ کاری کے لیے سرکاری اور نجی شعبوں کی شراکت سے ماحول سازگار بناتے ہوئے معاون پالیسیوں اور منڈی پر مبنی طریقہ کار کو فروغ دیا جائے۔[8]

یہ دعویٰ کیا گیا کہ سبز معیشت قدرتی سرمائے پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے براؤن ایکانومی کے برابر ترقی اور ملازمت کے مواقع پیدا کر سکتی ہے بلکہ ماحولیاتی اور معاشرتی فوائد کے ساتھ درمیانی اور لمبی مدت میں براؤن ایکانومی سے آگے بڑھ سکتی ہے۔[9] یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ گرین ایکانومی رپورٹ (GER) میں سرمایہ داری نظام جوں کا توں موجود ہے تبدیلی صرف نئی ٹیکنالوجی اور سرمایہ کاری کے نئے مواقعوں کے ذریعے لائی گئی ہے۔ اس کا واضح مقصد سرمایہ داری نظام کو موجودہ شدید معاشی بحران سے نکالنے میں مدد دینا ہے۔

سبز کاروبار کے لیے گیارہ شعبے رکھے گئے ہیں ان میں سے چار بنیادی شعبے قدرتی سرمائے پر مبنی ہیں یعنی زراعت، ماہی گیری، جنگلات اور پانی۔ ان ہی شعبوں میں قدرتی نظام کی خدمات کا حساب لگا کر انہیں بڑھانے یا قائم رکھنے کے لیے نئی سرمایہ کاری پر زور دیا گیا ہے۔ دیگر شعبوں میں توانائی، صنعت، فضلہ ٹھکانے لگانے کا کام، تعمیرات، ذرائع آمد و رفت، سیاحت اور شہری زندگی شامل ہے۔ یہ وہ شعبے ہیں جو سرمایہ کاری کے عمل سے گزر چکے ہیں، انہیں صرف سبز ٹیکنالوجی اپنانے کی ضرورت ہے جو کاربن اخراج کو کم کرے اور زیادہ ماحول دوست ہو۔

رپورٹ کے حساب و کتاب کے مطابق سالانہ سبز سرمایہ کاری 2011-2050 تک کم سے کم 1.2 ٹریلین (12 کھرب) ڈالر اور زیادہ سے زیادہ 3.4 ٹریلین (34 کھرب) ڈالر تک ہوگی۔[10] اس کے لیے حکومتوں کو ترغیب اور سہولتیں فراہم کرنی ہیں تاکہ نجی شعبہ، جسے بنیادی طور سے یہ کام انجام دینا ہے، کے ''منافع میں کمی واقع نہ ہو''۔ نجی شعبے میں بھی سبز معیشت بڑے بزنس کے حق میں بات کرتی ہے کیونکہ انہیں کے پاس سب سے زیادہ سرمایہ ہے۔ کسانوں سے مثال کے طور پر کہا جارہا ہے کہ وہ بڑی بڑی بین الاقوامی زرعی کمپنیوں کے ساتھ تعاون یا پارٹنرشپ کو آگے بڑھائیں کیونکہ ''ان کی سرمایہ کاری ہی یہ طے کرے گی کہ کیسے عالمی زراعت میں سبز اور پائیدار طریقوں کو فروغ ملے''۔[11] یعنی بڑی کمپنیوں کو اپنے پنجے گاڑنے کے لیے نیا کھلا میدان دینے کی کوشش ہو رہی ہے۔ حکومتوں سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ حکومتی اہلکاروں اور مقامی لوگوں کی سبز معیشت کے حوالے سے صلاحیت کو بڑھائیں تاکہ کمپنیوں کو اپنے کام میں آسانی کا سامنا رہے۔

سبز معیشت پر تنقید

یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ کیا سبز معیشت کاربن اخراج میں کمی لا سکے گی؟ اس کے جواب میں یہ کہا گیا ہے کہ 2011 سے 2050 تک کاربن کے اخراج میں ایک تہائی کمی واقع ہوگی لیکن 1990 کے اخراج کی سطح سے یہ کمی صرف چار سے سات فیصد ہوگی[12] جو ماحول میں گرین ہاؤس گیسیز کے اخراج کو 450ppm کی سطح پر رکھنے کے

ہدف سے بہت کم ہے۔ اب تو یہ بھی کہا جارہا ہے کہ 450ppm کی سطح کو 350ppm تک لانے کی ضرورت ہے۔ یہ بات بھی ظاہر ہے کہ ایک لمبے عرصے تک سبز اور براؤن معیشت ساتھ ساتھ چلیں گی۔ سبز معیشت کے پیروکار زیر زمین ایندھن کے استعمال پر تو سخت رویہ رکھتے ہیں لیکن نیوکلیئر (nuclear) توانائی اور کان کنی (mining) جس کے ذریعے دنیا کے بڑے ممالک اور سب سے بڑی کمپنیاں دنیا پر راج کررہی ہیں کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ سبز معیشت کاربن ٹریڈنگ کا زور دار طریقے سے پرچار کرتی ہے جبکہ اس طریقہ کار سے کاربن اخراج میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ مارکیٹ کی قوتیں جو معاشی بحران کی ذمہ دار تھیں وہ اب مستقبل کی سٹے بازی کے لیے کاربن ٹریڈنگ کو استعمال کررہی ہیں۔ افریقہ میں کاربن کی منڈی جنگلات کی زمین ہتھیانے کا بہانہ بن رہی ہے۔

یہاں یہ بتانے کی بھی ضرورت ہے کہ جب سبز معیشت قدرتی نظام کو قدرتی سرمایہ بناتے ہوئے قدرتی چیزوں کی قیمت لگانے کے ساتھ ساتھ منافع بخش چیزوں کو اپنانے اور بڑھانے اور باقی چیزوں کی قدر کم کرنے کا کام کرنا شروع کرے گی تو قدرت کی اکائی مزید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگی۔ اس سے ماحولیاتی توازن میں مزید بگاڑ پیدا ہوسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جب قدرتی وسائل کی پہنچ صرف ان لوگوں تک ہوگی جو اسے خرید سکتے ہیں تو غریب کی ان وسائل تک رسائی مشکل سے مشکل تر ہوجائے گی۔ برابری کی بنیاد پر تقسیم میں انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کی بجائے سبز معیشت غربت میں کمی امیروں کی ترقی کے صدقے ہی ممکن بناتی ہے۔ اسے ہم پائیدار ترقی کا راستہ کیسے کہہ سکتے ہیں۔

پائیدار ترقی کے راستے

یہ بات بجا طور پر کہی جارہی ہے کہ گرین ایکانومی رپورٹ نے اگرچہ پائیدار ترقی کے حوالے سے بہت سا مواد اکٹھا کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ دنیا پہلے کی طرح نہیں چل سکتی لیکن اس کا پائیدار ترقی کے لیے طریقہ کار ریو 1992 کے اصولوں، جنہیں عوامی تحریکوں نے مزید واضح کیا، سے بہت مختلف ہے۔[13] اگر ترقی یافتہ ممالک کے نزدیک پائیدار ترقی کی منزل حاصل کرنے کا یہی قابل عمل طریقہ ہے تو ترقی پزیر ممالک اور معاشرتی تحریکیں بھی اپنے لحاظ سے مختلف راستوں کے تعین کا حق رکھتی ہیں۔ اس کے لیے انہیں سب سے پہلے ریو 1992 میں پائیدار ترقی کے اصولوں (Rio Principles) کو دیکھنا ہوگا۔ ان میں دیگر اصولوں کے علاوہ مشترک لیکن الگ الگ ذمہ داریوں کا اصول (Principle of Common but Differentiated Responsibilities) اور پائیدار ترقی کے معاشی، معاشرتی اور ماحولیاتی ستونوں میں صحیح توازن کے ساتھ معاشرتی انصاف کی اہمیت ان کی رہنمائی کرسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ریو 1992 کے ایجنڈا 21 کو بھی دوبارہ دیکھنے کی ضرورت ہے جو مختلف ممالک کے حالات اور مفادات کو تسلیم کرتے ہوئے ترقی پزیر ممالک کی ضرورتوں اور خواہشوں کو اہمیت دیتا ہے کیونکہ وہاں عوام کی اکثریت رہتی ہے جو بھوک اور افلاس کا شکار ہے۔ تیسرا ہمیں اقوام متحدہ کے تحت انسانی حقوق کو آگے لے کر چلنا ہے۔ مستقبل کی بات چیت میں قومی اقتدار اعلیٰ کا احترام، ممالک کا اپنے وسائل پر اختیار اور مکمل عوامی شمولیت کی ضرورت پر بھی زور دینا ہوگا۔ حالیہ ماحولیاتی بحرانوں کی کثرت سے ہماری توجہ دو باتوں کی طرف جاتی ہے، ایک یہ کہ موجودہ فرسودہ استحصالی معاشی اور معاشرتی ڈھانچوں کی جگہ انصاف پر مبنی ماحول دوست نظام کی ضرورت ہے۔ دوسرے یہ سب کچھ بہت جلدی عوامی شمولیت و فیصلہ سازی کے ساتھ ہونا ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ ریو 2012 ان سب باتوں کے حوالے سے کہاں تک کامیاب رہی۔

ریو پلس 20 کانفرنس برائے پائیدار ترقی جون، 2012

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 2009 میں ایک قرار داد کے ذریعے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اقوام متحدہ کمیشن برائے پائیدار ترقی (United Nations Conference on Sustainable Development/ UNCSD) سال 2012 میں اعلیٰ سطح کی کانفرنس کا انعقاد کرے۔ یہ کانفرنس 1992 کی ارتھ سمٹ کے 20 سال بعد اس کی یاد میں ریو کے ہی کے مقام پر منعقد ہوئی۔ کانفرنس کے دو مقاصد رکھے گئے تھے: (i) پائیدار ترقی اور غربت کے خاتمے کے تناظر میں سبز معیشت کا فروغ، (ii) پائیدار ترقی کے لیے عالمی ادارے کا قیام۔ UNCSD (یو این سی ایس ڈی) کے زیرو ڈرافٹ ''مستقبل جو ہم چاہتے ہیں'' (The Future We Want) پر جنوری 2012 سے جون 2012 تک مختلف ممالک کے درمیان بحث جاری رہی۔ کوئی بھی ملک مسودے کے کسی بھی لفظ یا نکتے کو ترمیم کروانے کا حق رکھتا تھا۔ عوام کے میجر گروپوں[14] سے رائے لینے کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ جون کے مہینے میں ریو میں بات چیت 10 دن تک جاری رہی اس میں سربراہی کانفرنس کے لیے تین دن (22-20 جون) رکھے گئے تھے۔ اس کانفرنس میں 189 کے قریب ممالک اور 120 سربراہ مملکت شریک ہوئے۔ اس کے علاوہ 50,000 عوامی تحریکوں اور سول سوسائٹی کے نمائندوں نے بھی شرکت کی۔ مسائل کی ایک لمبی فہرست پر بات چیت ہوئی جس میں گلوبل وارمنگ، جنگلات کے خاتمے، ماہی گیری اور حیاتیاتی تنوع کی تباہی، پانی پر دباؤ، چھوٹے جزیروں کے مسائل، عورتوں کے مسائل، ماحولیاتی آلودگی وغیرہ شامل ہیں۔ کانفرنس کے شروع ہی میں ایک ٹیبلو کے ذریعے یہ بتایا گیا کہ: ''41 فیصد پانی اور خشکی دونوں جگہ رہنے والے جانور، 33 فیصد سمندر میں چٹان (reef) بنانے والے مونگے، 23 فیصد چوپائے اور 20 فیصد چڑیاں خطرے کی زد میں ہیں''۔ قدرت کے تحفظ کے عالمی ادارے (IUCN) کی صدر جولیہ مارٹن نے کہا کہ یہ اعداد و شمار ریو میں جمع قیادت کو کرہ ارض پر موجود زندگی کے جال کو محفوظ کرنے کے لیے فوری عملی راہ اختیار کرنے پر مجبور

کرتے ہیں۔15 یہاں یہ سوال کرنا ضروری ہے کہ قدرت کے اس جال کا تحفظ کس طرح بہتر طریقے سے ہوسکتا ہے؟

الف: قدرت میں پائی جانے والی ہر شئے اور خدمت پر قیمت کی پرچی لگا کر جیسے کہ سبز معیشت میں کیا جارہا ہے۔ یا

ب: قدرت سے ہم آہنگی میں رہنے والوں کو زیادہ بااختیار بنا کر جیسا کہ پائیدار ترقی میں کیا جانا چاہیے۔

چونکہ اس کانفرنس کو 1992 کی یاد میں منایا جارہا تھا لہٰذا یہ سمجھا جارہا تھا کہ کانفرنس 1992 کی روح دوبارہ اجاگر کرنے میں کامیاب ہوگی۔ 1992 کی ریو کانفرنس کے بنیادی اصول ''مشترک مگر الگ الگ ذمہ داریاں'' جس کا مطلب ہے کہ اگرچہ تمام ممالک کو قدرتی وسائل کا تحفظ اور ماحول کا احترام کرنا ہے لیکن کچھ ممالک پر جن کے پاس سب سے زیادہ سرمایہ ہے اور جنہوں نے ماحول کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے، پر اسے ٹھیک کرنے کی ذمہ داری زیادہ جاتی ہے۔ اس اصول کو ترقی یافتہ ممالک نے شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ ان ممالک (جن میں امریکہ، برطانیہ اور جرمنی شامل تھے) کے سربراہان مملکت نے تو کانفرنس میں شرکت کی زحمت نہیں کی کیونکہ وہ جی-20 (G-20) کی سربراہی کانفرنس کے لیے میکسیکو میں اپنے معاشی مسائل کے بحران سے نمٹ رہے تھے۔ یہی ممالک ان ترقی یافتہ ممالک کی صف میں آتے ہیں جو ماحولیاتی بحران کے حوالے سے اپنی ذمہ داری پوری کرنے کے لیے اپنی قومی آمدنی کا 0.7 فیصد بھی ادا نہیں کررہے۔

اب اگر ہم عالمی غربت کو دیکھیں تو یہ بھی اسی نظام کی پیدا کردہ ہے جس کی وجہ سے موسمی تبدیلی اور ماحولیاتی تباہی ہو رہی ہے۔ دولت کی منصفانہ تقسیم کے بغیر عالمی غربت میں کمی نہیں آسکتی اور جب آج کی ترقی موجودہ آبادی کی اکثریت کی بنیادی ضرورتیں پوری نہیں کرسکتی تو آئندہ نسلوں کی ضرورتوں کی بات کیسے ہوسکتی ہے؟ غربت ایسی حقیقت ہے کہ اس کو نظر انداز کرکے پائیداری کی کوئی بات آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ترقی کا حق جس میں شمالی اور جنوبی ممالک کی ترقی میں منصفانہ اصول کارفرما تھا۔ یہ اصول 1992 کی کانفرنس میں غربت کے خاتمے کے لیے ایک امید کی کرن تھا جو کہ 20 سال بعد منہدم ہوتا نظر آتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک 90 کی دہائی میں گلوبلائزیشن کے جوش میں اور اکیسویں صدی کے شروع میں معاشی بحران کی زد میں آکر ایسے نکات اور اصولوں کو برداشت نہیں کرنا چاہتے۔ بحث و مباحثہ میں پائے جانے والی بنیادی تفریق نے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں عدم اطمینانی کی فضا قائم کردی جو ریو کانفرنس کے آخری دس دنوں میں ابھر کر سامنے آئی۔ اسی نے ترقی پذیر ممالک کو مجبور کیا کہ وہ اکٹھا ہو کر 1992 کے اصولوں کا دفاع کریں۔16 اس کا نتیجہ ہوا کہ برازیل کی حکومت نے بطور میزبان خود یہ فیصلہ سنایا کہ وہ زیرو ڈرافٹ یعنی ''مستقبل جو ہم چاہتے ہیں'' کے مسودے کو آخری شکل دے گی۔ 19 جون کو برازیل کی حکومت نے نیا مسودہ تیار کرکے 20 جون کو سربراہی کانفرنس میں پیش کیا۔

یہ مسودہ 53 صفحات پر مشتمل دستاویز ہے جس میں 280 پیراگراف اور چھ حصے ہیں۔ پہلا حصہ ''ہمارا مشترکہ تصور'' پائیدار ترقی کے تین ستونوں یعنی معاشی، معاشرتی اور ماحولیاتی ترقی کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے مطابق ترقی کو تینوں سطحوں پر نظر آنا چاہیے۔ اس حوالے سے غربت کو فوری دور کرنے کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ پیداواری نظام اور صرف (consumption) کے انداز کو پائیدار بنانے اور معاشی اور معاشرتی ترقی کی بنیاد یعنی قدرتی وسائل کے تحفظ اور انہیں سنبھالنے کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ یہ بھی بتایا گیا کہ عوام کی ترقی ہی پائیدار ترقی کا محور ہے۔

اسی حصے میں ملینیم ڈیولپمنٹ گولز (Millennium Development Goals/MDGs) کے ترقی کے اہداف کو حاصل کرنے، اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کی پاسداری، انسانی حقوق کا احترام، جمہوریت، قانون کی حکمرانی اور اداروں میں شفافیت کو شامل کیا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ اقوام متحدہ کی کانفرنس سبز معیشت کو پائیدار ترقی اور غربت کے خاتمے کے تناظر میں دیکھے گی اور پائیدار ترقی کے عالمی ادارے کی تشکیل پر غور کرے گی۔ آخر میں پائیدار ترقی کے لیے فوری اور ٹھوس اقدامات کرنے کی بات کی گئی اور اس کے لیے لوگوں کے وسیع اتحاد کے ساتھ حکومتوں، سول سوسائٹی اور نجی شعبے کو مستحکم مستقبل کے لیے ساتھ مل کر کام کرنے کے لیے کہا گیا۔ یہاں یہ بھی بتاتے چلیں کہ منصفانہ ترقی کا لفظ معاشی ترقی اور انکلوزن17 (یعنی ''سب کو ملاتے ہوئے'') کے الفاظ کے ساتھ ہوا ہے انصاف پر مبنی معاشرتی ترقی کے ساتھ نہیں یعنی یہ دستاویز سارے فریقین کو ملاتے ہوئے مسائل کے حل کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔

''مستقبل جو ہم چاہتے ہیں'' کے مسودے میں دوسرے حصے میں پائیدار ترقی کے حوالے سے ریو پلس 20 سے پہلے کے معاہدوں اور اقدامات کا ذکر اور تجزیہ ہے اور مختلف اداروں اور بنیادی گروپوں کو شامل کرنے کا طریقہ کار واضح کیا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں سبز معیشت کا پائیدار ترقی اور غربت کے حوالے سے تفصیلی ذکر ہے۔ چوتھا حصہ پائیدار ترقی کے لیے بنائے جانے والے مختلف پہلوؤں کو واضح کرتا ہے جس میں اس ادارے کو چلانے میں عالمی معاشی اداروں اور اقوام متحدہ کے کردار کا بھی ذکر ہے۔ پانچویں حصے میں 25 کے قریب موضوعات (جن میں غربت کے خاتمے، خوراک کا تحفظ، پانی اور نکاسی، صحت، صنفی برابری سے لے کر سیاحت، ذرائع آمد و رفت، سمندر، چھوٹے جزیروں پر مشتمل ممالک، غریب ترین ممالک، موسمی تبدیلی، جنگلات حیاتیاتی تنوع وغیرہ) پر عملی کام اور ان کی نگرانی کے معاملات شامل ہیں۔ چھٹا حصہ بتاتا ہے کہ پائیدار ترقی کے پروگرام پر کیسے عمل درآمد کیا جائے۔ اس میں 1992 کے ایجنڈا21 کے طریقہ کار کو دیکھا گیا اور اس حوالے سے مالی، ٹیکنیکل اور تجارتی معاملات کا خصوصی طور سے جائزہ لیا گیا ہے۔

''مستقبل جو ہم چاہتے ہیں'' کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ اس میں ''ہر

چیز ہے جو ہر کسی کو درکار تھی'' (every thing that every body wanted) لیکن یہ مسودہ :

"... misses out on the most important ingredient -- a focus as well as a concrete action plan to provide some credence to this general statement of good intent". [18]

یعنی ''اچھی باتوں پر مبنی'' دستاویز میں عملی قدم اٹھانے کے لیے ہدف پر جس کڑی نگاہ کی ضرورت ہے وہ نظر نہیں آتی۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ نگاہ کی یہ خرابی کہیں سبز معیشت کو غربت اور پائیدار ترقی سے جوڑنے کی وجہ سے تو نہیں؟ کہیں سبز معیشت کا کام پائیدار ترقی کے ہدف سے ہٹانا تو نہیں؟ لیکن یہ بات کہ اس کانفرنس نے 1992 کے اہداف کو مٹنے نہیں دیا خود اس کانفرنس اور ''مستقل جو ہم چاہتے ہیں'' کی دستاویز کو کامیاب بناتا ہے۔ اب ہمارا کام ہے۔ اب پائیدار ترقی کے اہداف طے کرنے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ 2015 میں MDGs (ایم ڈی جیز) کے خاتمے کے بعد پائیدار ترقی کے اہداف (Sustainable Development Goals / SDGs) کا تعین کرنا ہے۔ اس کے لیے عوامی گروپوں کو متحرک ہو کر اپنی بات سامنے لانا ہے اور انہیں اپنی اپنی حکومتوں سے منوانے کے لیے ان پر اثر انداز ہونا ہے۔

ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ اس عرصے میں سبز معیشت کی باتیں کرنے والے کیا کر رہے ہیں۔ یہ خبریں آ رہی ہیں کہ ہر ملک اس حوالے سے اپنی اپنی دوکان سجا رہا ہے۔ مثلاً پاکستان میں جنوبی کوریا کے سفیر نے بتایا کہ ان کے ملک نے 2009 میں معاشی بحران کے دوران "stimulus package" (یعنی معیشت کو دوبارہ زندگی دینے کے لیے اقدام) کے طور پر اگلے چار سالوں کے لیے نیو گرین ڈیل (new green deal) کا پروگرام شروع کیا جو 956,000 نئے گرین ملازمت کے مواقع پیدا کر سکتا ہے۔ جنوبی کوریا کی تاجر برادری نے متبادل توانائی، ہائبرڈ گاڑیوں اور دیگر گرین ٹیکنالوجیوں کی سرمایہ کاری میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ اس سال جنوبی کوریا میں گرین ٹیکنالوجی سینٹر قائم کیا گیا ہے جو دوسرے ممالک سے تعاون کو بڑھائے گا۔ گرین ٹیکنالوجی جو چیزیں سامنے لا رہی ہے انہیں منڈی تک پہنچانے کے لیے یہ سینٹر کام کرے گا۔ اس حوالے سے جنوبی کوریا کے سفیر نے کہا کہ ''تقریباً 180 ملین پاکستانی عوام کے چھوٹے اقدام بھی (گرین اشیاء کو استعمال کرتے ہوئے موسمی تبدیلی کے عمل کو روکنے کے حوالے سے) ایک دیرپا اور بڑا اثر رکھیں گے''۔[19] کیا یہ سبز انقلاب جیسا منافع خوری اور قدرتی وسائل پر قبضے کا نیا اور زیادہ خوفناک پروگرام نہیں ہے؟

☆ ذہنی ملکیت کے حقوق (آئی پی آر) اور موسمی تبدیلی

ذہنی ملکیت کے حقوق کے تحت انسانی ذہنی تخلیق کی اشیاء کو قانونی تحفظ مل سکتا ہے یعنی حکومت سے پیٹنٹ رائٹرز یا سند مل سکتی ہے جس کے بعد ایک خاص مدت تک (عموماً 10 سے 20 سال) بلا شرکت غیر ایک شخص یا کمپنی اس شئے کو بنانے اور فروخت کرنے کا پورا اختیار رکھتا ہے۔ وہ دوسروں کو اس کی نقل بنانے، منڈی میں فروخت کرنے، برآمد کرنے یا کسی دوسری طرح کا فائدہ اٹھانے سے بھی روک سکتے ہیں۔ اس قسم کی قانون سازی کاروبار کی ضرورت ہوتی ہے۔ حتمی ذہنی ملکیت کے حقوق پہلی دفعہ ڈبلیو ٹی او کے ذہنی ملکیت کے معاہدے ٹرپس (Trade-related Aspects of Intellectual Property Rights/TRIPs) میں دیے گئے تھے۔

موسمی تبدیلی کی بحث میں کاربن کے اخراج میں کمی کی ذمہ داری 1992 کی ارتھ سمٹ نے ترقی یافتہ ممالک پر لگائی تھی کیونکہ وہی تاریخی طور سے اور اب بھی سب سے بہت زیادہ کاربن کا اخراج کر رہے ہیں۔ اپنے اخراج میں کمی کی یہ ذمہ داری وہ اپنے ملک میں اخراج کم کرنے کے بجائے ترقی پزیر ممالک میں اخراج کم کر کے کرنا چاہتی ہیں۔ ترقی پزیر ممالک پر 1992 کی ریو کانفرنس نے ایسی کوئی ذمہ داری نہیں لگائی تھی۔ اب ترقی پزیر ممالک یہ ذمہ داری قبول کرتے ہوئے کم از کم متبادل ٹیکنالوجی کا اصول بغیر آئی پی آر کے چاہ رہے ہیں تاکہ یہ ٹیکنالوجی مقامی سطح پر منتقل ہو کر سستی ہو اور غریب عوام کے لیے نچلی سطح پر شراکتی طور پر استعمال کی جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ سبز سرمایہ کاری غیر قدرتی چیزوں کے بجائے زیادہ تر قدرتی چیزوں پر ہو رہی ہے مثلاً پانی، زمین، جنگلات وغیرہ۔ ان قدرتی وسائل اور ان سے حاصل کی گئی خدمات کی قیمتیں لگ رہی ہیں تاکہ ان کا ''تحفظ'' ہو سکے۔ سبز ٹیکنالوجی میں کئی طرح کی ٹیکنالوجی اور دیگر جدید طریقوں سے مثلاً جیو انجینئرنگ، نینو ٹیکنالوجی وغیرہ کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ ان پر بھی آئی پی آر کی شقیں لگا کر ان سے منافع کمانے کے منصوبے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے قدرتی سرمائے پر بیرونی کمپنیوں کے قبضے کو یقینی بنانے کا نہایت خطرناک منصوبہ بنایا گیا ہے۔ اس منصوبے کا راستہ سب سے پہلے 1980 میں امریکی سپریم کورٹ کے ایک فیصلے نے کھولا تھا جس میں جاندار چیزوں کو پیٹنٹ کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس کے بعد جینیاتی سائنس کو فروغ ملا اور جینیاتی بیجوں کے ذریعے چند بیج کی کمپنیاں زراعت کی دنیا پر چھا گئیں۔ یہ وہ بیج ہیں جو انسانی صحت سے لے کر ماحول تک ناقابل تلافی نقصانات کی ذمہ دار ہیں۔ ان بیجوں کو اب موسمی تبدیلی کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھنے والے بیجوں کے طور پر بھی منڈی میں فروغ دیا جا رہا ہے۔ اس حوالے سے اس رسالے میں مستقل بحث کی گئی ہے۔ اس شمارے میں بھی الگ سے اس موضوع پر کچھ مضامین شامل ہیں۔ پاکستان میں پلانٹ بریڈرز رائٹ ایکٹ قومی اسمبلی میں زیر غور ہے۔ جب بھی یہ لاگو ہوگا حکومت پاکستان سے لے کر عام کسان تک کسی کو بھی یہ کمپنیاں اپنے ذہنی ملکیت کے حقوق کو منوانے کے لیے کورٹ میں کھینچ سکتی ہیں۔

سبزمعیشت دراصل پائیدارترقی کی منزل کے نشان مٹانے کا کام کرتے ہوئے سرمایہ داری کی سانسیں برقرار رکھنے کے لیے آکسیجن کی فراہمی کو یقینی بنارہی ہے!

حوالہ جات

کوپن ہیگن کانفرنس آف پارٹیز (COP 15) تک کی سیاست کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل تحقیق کو بنیاد بنایا گیا ہے:

1. K. Prabhakar Nair, Weathering the climate crisis: the way of ecological agriculture, Pesticide Action Network and the Pacific (PAN AP), Penang, Malaysia, 2010, pp. 44-51.

2۔ امریکہ نے 2005 کی سطح سے 2020 تک 17 فیصد کمی پر آمادگی ظاہر کی جسے اگر 1990 کی سطح سے دیکھا جائے تو یہ صرف پانچ فیصد بنتی ہے۔ یورپی یونین (EU) نے 30 فیصد کمی کا اعلان کیا اگر دوسرے امیر ممالک بھی ایسا کریں ورنہ EU (ای یو) ممالک 20 فیصد کمی پر رضا مند تھے۔ یہ سب ملا جلا کر 1990 کی سطح سے کاربن اخراج میں 18-12 فیصد کمی پیدا کرسکتی ہے۔ دیکھیے ایضاً، صفحہ 47۔

3۔ بائیو فیول، جو حالیہ غذائی بحران کی ایک وجہ قرار دیا جاچکا ہے، کو فصلوں سے حاصل کیا جاتا ہے جس کے لیے زمین کا بہت وسیع رقبہ درکار ہوتا ہے۔ جیو انجینئرنگ میں موسمی بحران کا مقابلہ سائنس پر مبنی ٹیکنیکل طریقے سے کیا جاتا ہے مثلاً اس میں سمندر میں کائی کی مقدار کو بڑھانا یا سمندر کے پانی کو بادلوں پر اسپرے کرنا جیسے مختلف طریقے شامل ہیں۔

4. "Cancun meeting reaches climate change agreement", accessed from http://www.telegraph.co.uk/earth/environment/climatechange/81960...

5۔ ایضاً۔

6. "Climate talks end with hope for a new more comprehensive legally - binding agreement" Sun, 11 December, 2011, accessed from http://www.unep.org/newscentre/Default.aspx?DocumentID=2661&ArticleID=8984&l=en

7۔ سبز معیشت کے تاریخی پس منظر کے لیے دیکھیے:

Verzola et al. "Green Economy: gain or pain for Earth's poor?", EDM: Education for Development, 10:3 (May - June, 2011), Quezon City, Philippines, p. 4.

8۔ ایضاً صفحہ 5۔ 9۔ ایضاً۔ 10۔ ایضاً۔

11۔ ایضاً، صفحہ 6۔ 12۔ ایضاً۔ 13۔ ایضاً، صفحہ 9۔

14۔ کانفرنس میں عوامی نمائندوں کو نو گروہوں میں تقسیم کیا گیا تھا: عورتیں؛ بچے اور نوجوان؛ مقامی لوگ؛ غیر سرکاری تنظیمیں؛ مقامی حکومتیں؛ مزدور اور ٹریڈ یونین؛ بزنس اور انڈسٹری؛ سائنس اور ٹیکنالوجیکل کمیونٹی اور کسان۔

15۔ ڈان، 20 جون، 2012، صفحہ 12۔

16۔ ملک امیر خان، "Glass half full at Rio"، دی نیوز، 26 جون، 2012، صفحہ 6۔

17۔ اس لفظ پر بحث کے لیے دیکھیں عذرا طلعت سعید، ''پائیدار ترقی: جدوجہد کی منزلیں اور ...'' چیلنج، کراچی، اپریل تا جون، 2012، صفحہ 7۔

18۔ ملک امیر خان، op.cit.۔

19. Choog Joo Choi. "Towards green growth." *The Express Tribune*, 5 June. 2012, p.7.

کسان اور سائنسی گروہوں کی طرف سے
فلپائن میں جی ایم اوز سے پاک زراعت کی قانون سازی کی حمایت

کے ایم پی، ماسی پاگ اور ایگرو کیمیکل ٹی این سیز کے خلاف مزاحمتی اتحاد (Resist Agrochem TNCs) نے فلپائن کے ایوان میں پیش کردہ 6454 (HB) مسودہ قانون کی حمایت کی ہے ''جس کے ذریعہ فلپائن کی زراعت اور دوسرے کاموں میں ایسی مصنوعات کو ممنوع قرار دیا گیا ہے جن میں جینیاتی طور پر ترمیم شدہ نامیات (GMOs) شامل ہوں''۔

کسانوں کے رہنما ڈاکٹر چیتو مدینہ (Chito Medina) نے یہ کہا کہ ''رکن ایوان ماریانو (Mariano) کا یہ بر وقت اقدام ہے۔ خاص طور سے ایسے وقت میں جبکہ بین الاقوامی چاول تحقیقاتی ادارہ (International Rice Research Institute/IRRI) فلپائن رائس تحقیقاتی انسٹی ٹیوٹ (PhilRice) کے ساتھ مشترکہ طور پر کئی مقامات پر تجرباتی فارموں میں گولڈن رائس یا وٹامن اے چاولوں پر تجربے کر رہے ہیں (ان مقامات میں شامل ہیں: Camarines, Nueva Ecija and Ilocos Norte)''۔

گولڈن رائس (Golden Rice) جینیاتی طور پر تبدیل شدہ چاول ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں بیٹا کیروٹین (beta-carotene) شامل ہے جو حیاتین اے یا وٹامن اے پیدا کرتا ہے۔ اس کو فروغ دینے والوں کا کہنا ہے کہ اس سے وٹامن اے کی کمی کا مسئلہ حل ہوجائے گا۔ بہرکیف ماسی پاگ کے قومی رابطہ کار اور ریزسٹ (Resist) کے کنوینر ڈاکٹر چیتو مدینہ کا بیان ہے کہ گولڈن رائس صنعتی زراعت کا ایک ماڈل ہے جس کے نتیجے میں حیاتیاتی تنوع اور خوراک کے ذرائع محدود ہوجاتے ہیں۔ ڈاکٹر مدینہ کا یہ بھی کہنا ہے کہ جی ایم غذا صارفین کے لیے خطرناک ہیں کیونکہ جوں جوں آزادانہ سائنسی تجربات سامنے آرہے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ جی ایم اوز سے صحت کے مسائل پیدا ہوں گے۔

اقوام متحدہ کا کردار: سامراجی تسلط اور طبقاتی نظام

تحریر: نوید اقبال

دوسری عالمی جنگ کے بعد اقوام متحدہ نے جس بنیادی انسانی حقوق کے چارٹر کو پیش کیا اس کا مقصد بظاہر انصاف پر مبنی پر امن دنیا کا قیام تھا لیکن تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ یہ چارٹر سامراجی قوتوں کا پھیلایا ہوا ایسا جال ہے جس کے ذریعے انسان کو انفرادی انسانی حقوق کی بحث میں الجھا کر اپنے سامراجی تسلط کے تحفظ کو یقینی بنایا گیا ہے۔ اس جال میں پھنس کر انسان تمام تر زندگی اپنے انفرادی حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد تو کرتا رہتا ہے لیکن کبھی بھی ان حقوق کے نہ ہونے کی اس بنیادی وجہ کو سوال نہیں کرتا جس سے ظلم کے بے شمار ابواب کھلتے ہیں یعنی طبقاتی تفریق پر قائم نظام۔ چونکہ طبقاتی تفریق کی بنیاد پر قائم سماج سے ہی اس نظام کی سانسیں چلتی ہیں اس لیے شعوری طور پر یہ کوشش کی جاتی ہے کہ ہر درجے پر یہ تفریق ہر حال میں قائم رہے۔ کیونکہ اگر کھیتوں میں کام کرنے والے کسان اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور نہ رہیں گے تو اس نظام کا پیداواری عمل کیسے آگے بڑھے گا۔ کس طرح کسان اور مزدور کی محنت کا وہ استحصال ممکن ہوگا جس سے سرمایہ دار اور جاگیردار کی بادشاہت قائم ہے۔ اس لیے اس ظلم کو برقرار رکھنے کے لیے اس نظام کے اندر اقوام متحدہ، اس کے ذیلی ادارے اور ریاستی ڈھانچے ایک منظم انداز میں اس طرح کام کرتے ہیں کہ ہمیں کبھی یہ گمان ہی نہیں ہوتا کہ ہمارے ساتھ ایک سوچا سمجھا کھیل کھیلا جارہا ہے۔ یہ تمام تر ادارے جو بظاہر انسان دوست نظر آتے ہیں کسی بھی مظلوم کی داد رسی محض اس لیے کرتے ہیں کہ کہیں آج کی کوئی چنگاری کل کو شعلہ بن کے اس نظام کی بنیادوں کو ہلا نہ دے کیونکہ اس نظام کی بنیاد ہی ظلم پر قائم ہے۔

اس مضمون میں اقوام متحدہ کے اسی مبہم کردار کا خاکہ کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے جس کا تعلق اس سرمایہ داری نظام کو مضبوط کرنے کے علاوہ سامراجیت کے تسلط کو برقرار رکھنے کے ساتھ ہے۔ اس ضمن میں اقوام متحدہ کا عالمی ادارہ برائے خوراک و زراعت (Food and Agriculture Organization/FAO) کی پالیسیوں کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ بیج کی سیاست کے حوالے سے بین الاقوامی زرعی تحقیق کے مشاورتی گروہ (Consultative Group on International Agriculture Research/CGIAR) کے قیام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر موسمی تبدیلی کے تحت اقوام متحدہ کا کنونشن برائے موسمی تبدیلی (United Nations Framework Convention on Climate Change/UNFCCC) کے کردار اور کیوٹو پروٹوکول (Kyoto Protocol) کے ذریعہ منڈی پر مبنی ماحولیاتی بحران کے حل کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد پائیدار ترقی کے نام پر اقوام متحدہ کے کردار کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح اس نے سبز معیشت کے ماڈل کو پیش کرتے ہوئے تیسری دنیا کے عوام اور وسائل کے استحصال کے نئے ہتھکنڈے پیش کیے ہیں۔ اس کے بعد اقوام متحدہ کے کنونشن برائے حیاتیاتی تنوع (Convention on Biodiversity/CBD) کا احاطہ سرمایہ داری کو مضبوط کرنے کے تناظر میں کیا گیا ہے اور پھر مضمون کے آخر میں ان تمام عالمی معاہدوں، کنونشنز کا تنقیدی تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ کس طرح اقوام متحدہ اور اس کے تحت مختلف اقدامات عالمی سطح پر تیسری دنیا کے عوام اور ماحول کے استحصال کی راہ ہموار کررہے ہیں۔

سامراجی بیج: ویپنز آف ماس ڈسٹرکشن (Weapons of Mass Destruction)

> ''..... لوگ خوراک کے حوالے سے امریکہ کے محتاج ہوسکتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ کوئی اچھی خبر نہیں سمجھی جائے گی، مگر میرے لیے یہ اچھی خبر ہے۔ کیونکہ کچھ بھی کرنے سے پہلے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کا سہارا لیں اور آپ کے محتاج ہوں تو میرے خیال میں لوگوں کو خوراک کا محتاج کردیا جائے تاکہ جس طرح کا بھی تعاون ان سے درکار ہو وہ باآسانی حاصل کیا جاسکے .....''۔ 1

انسان نے صدیوں پر محیط تجربات اور علم کی بنیاد پر جس طریقہ زراعت کو پائیدار بنیادوں پر سمجھتے ہوئے اپنی زندگی سے ہم آہنگ کیا تھا، اس کے نتیجے میں اس کرہ ارض پر تنوع حیات کی کثرت کے ساتھ ساتھ عمدہ بیجوں کی بے شمار اقسام موجود تھیں۔1957 میں امریکی سینیٹر ہمفرے کے اوپر دیے گئے اقتباس کو اگر 60 کی دہائی میں پیش کیے جانے والے سبز انقلاب سے جوڑیں تو سرمایہ داری کے کئی مفادات سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ سبز انقلاب کی پالیسی کے ذریعہ متعارف کروائی جانے والی زیادہ پیداوار دینے والی اقسام (High Yielding Varieties/HYVs) کو جہاں سامراجیت نے ایک طرف سرخ انقلاب کا راستہ روکنے کے لیے استعمال کیا وہیں زراعت کو پائیدار طریقہ زندگی سے ہٹا کر منافع کمانے کا ذریعہ بھی بنایا۔ جس کے نتیجے میں میلوں بڑے اور لمبے زرعی رقبوں پر منڈی کی طلب کو مدنظر رکھتے ہوئے فصلوں کی کاشت ہونے لگی۔ چونکہ ان بیجوں کو اس طرح تیار کیا گیا تھا کہ صرف کیمیائی کھادوں کے استعمال پر ہی پیداوار دیتے تھے اس لیے زیادہ سے زیادہ پیداوار کے حصول کے لیے کیمیائی کھادوں کے ساتھ ساتھ زرعی ادویات کا بے دریغ استعمال کیا جانے لگا۔ نتیجتاً اس زہر کے استعمال سے صدیوں کے عمل میں بننے والی تنوع حیات کی تمام تر دولت گھڑیوں میں منڈی کے ذریعے منافع کی بھینٹ چڑھ گئی۔ یعنی ایک طرف ہمارے روایتی بیجوں کی کاشت وقت کے ساتھ ساتھ کم سے کم ہوتی گئی تو دوسری طرف مونوکلچر

(بڑے بڑے زرعی رقبوں پر ایک ہی قسم کی فصل کی کاشت)، کیمیائی کھادوں اور زہریلی زرعی ادویات کے بے دریغ استعمال کی وجہ سے حشرات، چرند پرند کی بے شمار اقسام معدوم ہوتی گئیں۔ ان بیجوں کے لیے پانی کی بڑھتی ہوئی ضرورت کے پیش نظر ٹیوب ویل کا استعمال فروغ پاتا چلا گیا جس سے زیر زمین پانی کے ذخائر پر بے تحاشا دباؤ بڑھا۔ ٹریکٹر کی آمد سے ہم جیسے تیسری دنیا کے ممالک میں کھیت پر کام کرنے والے بیشتر مزدور جب اپنے روزگار سے محروم ہوئے تو نتیجتاً شہروں میں نقل مکانی کا رجحان بڑھا جس سے پھر شہروں میں کچی آبادیوں نے جنم لیا۔

سبز انقلاب کی پالیسی کو اگر وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کی بنیاد پر پرکھا جائے تو اس کا فائدہ مقامی سطح پر جاگیردار اور بڑے زمیندار کو ہوا جبکہ عالمی سطح پر اس سے نجی سرمایہ دار کمپنیوں نے بے تحاشا منافع کمایا۔ جاگیردار یا بڑے زمیندار چونکہ وسائل پر قابض تھے اور آج تک ہیں اس لیے ان کے لیے اس نئے بیج کی ضرورت یعنی کیمیائی کھاد اور پانی کو پورا کرنا ہرگز مشکل نہ تھا۔ مزید یہ کہ جب ٹریکٹر، دیگر مشینری اور کیمیائی زرعی ادویات کے استعمال کے ساتھ ساتھ پیداوار میں اضافہ ہوتا گیا تو یہ جاگیردار اور بڑے زمیندار صنعت کار اور سرمایہ کار کا روپ بھی دھارتے چلے گئے۔ جب کہ دوسری طرف چھوٹے کاشت کاروں کے لیے اپنے محدود وسائل میں رہتے ہوئے اس نئے بیج کے لیے لازم زرعی مداخل کا حصول اور استعمال تقریباً ناممکن ہوتا گیا۔ نتیجتاً اس پالیسی نے چھوٹے کاشت کاروں کو قرض کی ایسی دلدل میں دھکیلا جس سے یا تو زمین بیچ کر چھٹکارا حاصل کیا گیا یا پھر زمین ٹھیکے پر دے کر۔

وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کو پھر سے بنیاد بناتے ہوئے اگر ہم سبز انقلاب کی پالیسی کو خوراک تک رسائی کے حوالے سے پرکھیں جسے دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی اور اس سے جڑی ہوئی بھوک کے خاتمے کے طور پر پیش کیا گیا تو حقیقت خود بہ خود ہم پر واضح ہوجائے گی۔ پیٹر روزیٹ (Peter Rosset) جو ماحولیاتی زراعت میں پی ایچ ڈی ہیں اپنے ایک مضمون "Lessons from the Green Revolution" میں اسی نکتے کو واضح کرتے ہیں کہ دنیا بھر میں اگر بھوک کے شکار افراد کا 1970 اور 1990 کی دہائیوں میں موازنہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ان دو دہائیوں میں خوراک میں 11 فیصد فی کس اضافہ دیکھا گیا اور بھوک کے شکار افراد کی تعداد 16 فیصد کمی کے ساتھ 942 ملین سے کم ہو کر 786 ملین رہ گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ سبز انقلاب سے خوراک کی پیداوار میں اضافہ ہوا تھا تاہم ہمیں بھوک کے شکار افراد کے حوالے سے اس نظام کی گندگی کو سمجھنا ہوگا۔ اسی مضمون میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر چین کو اس معاملے سے ہٹا کر اعداد و شمار پر نظر ثانی کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان دو دہائیوں میں دنیا بھر میں بھوک کے شکار افراد کی تعداد میں 11 فیصد اضافہ ہوا۔ یعنی یہ تعداد 536 ملین سے بڑھ کر 597 ملین ہوگئی۔ لاطینی امریکہ میں اگرچہ خوراک میں فی کس تقریباً آٹھ فیصد اضافہ دیکھا گیا لیکن بھوک کے شکار افراد کی تعداد میں 19 فیصد اضافہ ہوا۔ جنوبی ایشیاء میں 1990 میں اگرچہ خوراک میں فی کس نو فیصد اضافہ دیکھنے میں آیا تاہم بھوک کے شکار افراد کی تعداد میں بھی نو فیصد اضافہ ریکارڈ کیا گیا۔ خوراک میں فی کس اضافے کو بنیاد بناتے ہوئے اگر ہم سمجھیں تو یہ صاف ظاہر ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی بھوک کے بڑھنے کی بنیادی وجہ نہیں تھی کیونکہ خوراک کی فی کس پیداوار تو اضافی تھی بلکہ اس نظام میں گوندھی ہوئی طبقاتی تفریق اور وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم بھوک میں اضافے کی بنیادی وجہ تھی۔ چین میں بھوک کے شکار افراد کی تعداد 406 ملین سے کم ہو کر 189 ملین رہ گئی۔ اس تناظر میں سبز انقلاب اور چین کے انقلاب کا باہم موازنہ کرتے ہوئے ہم خوراک کی سیاست کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں جس کی ہیمفرے کے اقتباس میں اوپر عکاسی کی گئی ہے۔

اقوام متحدہ کا کردار

1۔ عالمی ادارہ برائے خوراک و زراعت

بنیادی انسانی حقوق کے چارٹر کے آرٹیکل 25 میں خوراک کے جس بنیادی حق کو تسلیم کیا گیا تھا اس ضمن میں FAO (ایف اے او) کا قیام 16 اکتوبر، 1945 کو کینیڈا کے شہر کیوبک میں عمل میں آیا۔ اس ادارے کا بنیادی مقصد بھوک کے خاتمے کے ساتھ ساتھ ترقی پزیر اور ابھرتی ہوئی معیشت والے ممالک کے لیے علم اور معلومات کا ایسا ذریعہ فراہم کرنا تھا جس کو استعمال کرتے ہوئے وہ بہتر طریقہ زراعت، ماہی پروری اور جنگلات کے ذریعے سب کے لیے اچھی، غذائیت سے بھرپور غذا کے ساتھ ساتھ خوراک کے تحفظ کو یقینی بنا سکیں۔ تحفظ خوراک کو اگر سمجھا جائے تو یہ نظریہ ایف اے او کے مطابق بنیادی طور پر تین ستونوں پر کھڑا ہے۔

1۔ خوراک کی موجودگی: مقامی اور عالمی سطح پر ایسی کوششوں کا کیا جانا کہ جس کے ذریعے سب کے لیے خوراک کی موجودگی یقینی ہو۔
2۔ خوراک تک رسائی: معاشی اور جسمانی طور پر خوراک تک پہنچ کو یقینی بنایا جائے۔
3۔ خوراک کا استعمال: نگہداشت اور غذائیت کی بنیاد پر خوراک کے استعمال کے ساتھ ساتھ پانی اور نکاسی آب کی مناسب سہولیات کو یقینی بنایا جائے۔

ایف اے او نے تحفظ خوراک کے تحت خوراک کی موجودگی کو ہر طور یقینی بنانے کے اصول کے ذریعے مقامی اور عالمی سطح پر زرعی نجی کمپنیوں کے لیے تو جگہ پیدا کردی تاہم خوراک تک رسائی کے حوالے سے عوام کے حق میں کسی قسم کی گنجائش پیدا نہ کی۔ زرعی تجارت کے حوالے سے ایف اے او نے اپنی حالیہ رپورٹ میں بتایا ہے کہ ''ترقی پزیر ممالک میں برآمدات کی تجارت کے حوالے سے بڑی کمپنیاں حاوی ہیں۔ دو بڑی کمپنیاں ایک کارگل [حالیہ مونسانٹو] جو امریکہ کی سب سے بڑی نجی کمپنی ہے اور دوسری ارچر ڈینیل مڈ لینڈ (Archer Daniels Midland/ADM) 75 فیصد غلے کی عالمی تجارت پر قابض ہیں (45 فیصد اور 30 فیصد بالترتیب)''۔[2] اسی طرح تحفظ خوراک

کے اگر ہم دوسرے اصول کو سمجھیں تو خوراک تک رسائی کو محض معاشی حوالے سے پیش کیا گیا ہے یعنی ایف اے او کے مطابق اس کا مطلب صرف اور صرف یہ تھا کہ عوام کے پاس اتنا پیسہ ہو کہ وہ خوراک خرید سکیں۔ اس طرح اس معاشی رسائی کا مطلب یہ ہوا کہ عوام کے ہاتھ میں پیداواری وسائل دینے کی بجائے اقوام متحدہ جیسے ادارے نے محض صارف پیدا کر کے سرمایہ داری نظام کو فروغ دیا ہے۔ جب کہ دوسری طرف اگر چین کے انقلاب کو لیا جائے جس میں حقیقی زمینی اصلاحات عمل میں آئی تھیں اور پیداواری وسائل کو عوام کے اختیار میں دیا گیا تھا تو اس سے صرف دو دہائیوں میں بھوک کے شکار افراد کی تعداد میں 217 ملین کی کمی سامنے آئی تصویر کا دوسرا رخ اس سے بھی زیادہ بھیانک ہے۔ وہ اس طرح کے سامراجی تسلط کے حوالے سے تیسری دنیا کی ممالک میں خوراک تک رسائی کے ضمن میں عوام کو حکومت کی طرف سے پہلے جو مراعات حاصل بھی تھیں ان کا بھی 90 کی دہائی میں نیولبرل ایجنڈے کے تحت خاتمہ ہوتا چلا گیا۔ جس میں حکومتوں کے کردار کو تین پالیسیوں کے ذریعے محدود سے محدود تر کیا گیا۔

1۔ ڈی ریگولیشن یعنی حکومت کے اختیار کا خاتمہ۔

2۔ پرائیوٹائیزیشن یعنی نجکاری۔

3۔ ٹریڈ لبرلائزیشن یعنی آزاد تجارت۔

مثال کے طور پر حکومت پاکستان غلہ مرکزی اور صوبائی سطح پر ذخیرہ کر کے یہ بات یقینی بناتی تھی کہ اگر غلے کی کمی ہو جائے تو حکومت خود عوام کے لیے تحفظ خوراک کا انتظام کر سکے۔ ڈی ریگولیشن کے تحت حکومتی گوداموں کو زبردستی نجی شعبے میں فروخت کر دیا گیا۔ اب جب کہ ماحولیاتی بحران کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر خوراک کی کمی واقع ہوتی ہے تو ایف اے او کا ایک ذیلی ادارہ ڈبلیو ایف پی (World Food Program /WFP) آگے بڑھ کر اس کمی کو پورا کرتا ہے۔ نیولبرل ایجنڈا کے تحت آزاد تجارت کے اصول کو بڑی آسانی سے لاگو کرتے ہوئے ڈبلیو ایف پی تقریباً تمام غلہ امریکی نجی کمپنیوں سے حاصل کر کے کم غذا کی شکار آبادیوں میں فراہم کرنے کی ذمہ داری اٹھا رہا ہے۔[3] ایک مثال اور ہے کہ ایف اے او نے خاص کر جینیاتی بیجوں کو خوراک کی کمی کی شکار آبادیوں کے لیے غذا کی فراہمی کا ایک بہتر ذریعہ قرار دے دیا۔ یہاں تک کے گولڈن رائس جو کہ جینیاتی طریقے سے پیدا کیا گیا چاول ہے کو بہت سراہا گیا ہے۔

نیولبرل ایجنڈے کے تحت ان تینوں پالیسیوں کے نتائج ترقی پزیر ممالک میں غربت اور بھوک میں بے پناہ اضافے کی صورت میں سامنے آئے ہیں۔ اس طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ غربت میں اضافے کی بنیادی وجہ سامراج کی وہ پالیسیاں ہیں جو سبز انقلاب سے شروع ہو کر نیولبرل ایجنڈے کی شکل میں 90 کی دہائی میں تیسری دنیا کے عوام پر مسلط کی گئیں۔

2۔ سی جی آئی اے آر

1970 میں راک فیلر فاؤنڈیشن (Rockefeller Foundation) نے یہ تجویز پیش کی کہ دنیا بھر میں زرعی تحقیق کرنے والے ادارے ایک مستقل سیکریٹریٹ کے تحت آجائیں۔ اس ضمن میں 1971 میں ایک ادارہ سی جی آئی اے آر کا قیام عمل میں آیا۔ اس ادارے کے قیام میں ایف اے او، عالمی فنڈ برائے زرعی ترقی (International Fund for Agricultural Development /IFAD)، اقوام متحدہ کا پروگرام برائے ترقی (United Nations Development Program/UNDP) اور ورلڈ بینک نے فنڈ فراہم کیے۔ اس وقت اس ادارے نے چار تحقیقاتی مراکز کو مدد فراہم کی جن میں CIMMYT، IRRI، ICTA اور IITA شامل تھے۔[4] یہاں یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ راک فیلر فاؤنڈیشن نے اس سے پہلے میکسیکو حکومت کے ساتھ مل کر CIMMYT کا تحقیقاتی ادارہ قائم کیا تھا جہاں سبز انقلاب میں زیادہ پیداوار دینے والی گندم یعنی میکسی پاک اور دیگر اجناس کی بیجیں تیار کی گئی تھیں۔ دنیا بھر میں تمام زرعی تحقیقاتی مراکز کو ایک چھتری کے تحت کرنے کا مقصد ایک طرف ترقی یافتہ ممالک کا پوری دنیا میں پائی جانے والی نباتات کے جینیاتی مواد پر قبضہ جمانا اور دوسری طرف تمام تر سائنسی زرعی تحقیق کو سامراجی خطوط سے ہم آہنگ کرنا تھا۔ اس سوچ کے ثبوت کے لیے اگر سی جی آئی اے آر کی ویب سائٹ کو دیکھیں تو اس کے مطابق 1971 میں جن ترقی یافتہ ممالک، ترقیاتی اداروں اور فاؤنڈیشنز نے ممبر شپ حاصل کی ان کے کل تعداد 20 تھی۔ ان میں سے 11 ترقی یافتہ ممالک تھے جن میں سے جی-7 کے پانچ ممالک امریکہ، برطانیہ، جرمنی، فرانس اور کینیڈا شامل تھے۔ جی-7 کے باقی دو ممالک میں سے جاپان نے 1972 اور اٹلی نے 1975 میں اس کی ممبر شپ حاصل کی۔ ترقیاتی اداروں میں انٹر امریکن ڈیولپمنٹ بینک (Inter-American Development Bank)، ایشین ڈیولپمنٹ بینک، ایف اے او، UNDP (یو این ڈی پی)، بین الاقوامی ادارہ برائے ترقیاتی تحقیق (International Development Research Centre) اور ورلڈ بینک شامل تھے جبکہ فاؤنڈیشنز میں ڈبلیو کے کیلوگ (W.K. Kellog) اور فورڈ فاؤنڈیشن شامل تھیں جو کہ دونوں بڑی بڑی زرعی بین الاقوامی امریکی کمپنیوں کے کاروبار کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ سی جی آئی اے آر کے بننے کے تقریباً 10 سال بعد ہی امریکہ کی سرمایہ کار بائیوٹیکنالوجی کمپنیوں نے اس جینیاتی بیش بہا دولت کو بطور خام مال استعمال کرتے ہوئے جینیاتی انجینئرنگ کے ذریعے غیر فطری طور پر نئے جاندار (پودے اور جانور) پیدا کرنے کا عمل شروع کیا۔ اس جینیاتی انجینئرنگ کے ذریعے تیار کردہ جانداروں کی مثال آج ہمارے اردگرد جینیاتی مکئی، بی ٹی کپاس اور گولڈن رائس کی صورتوں میں موجود ہے۔ ایف اے او جیسے ''عوام دوست'' ادارے نہ کہ اس طرح جینیاتی مواد کی کھلی چوری کو روکتے اس نے سی جی آئی اے آر جیسے ادارے کی پشت پناہی کر کے جینیاتی انجینئرنگ کے فروغ کے ذریعے سامراجی تسلط کی راہ ہموار کی۔

عالمی اشرافیہ، ماحولیاتی بحران کی ذمہ دار

یو این ڈی پی کی رپورٹ جو سال 1999 میں شائع ہوئی تھی میں دنیا کے پانچ امیر ترین ممالک اور پانچ غریب ترین ممالک کی اوسط آمدنی کا موازنہ کیا گیا تھا۔ رپورٹ کے اندر امیر اور غریب ممالک کے درمیان اوسط آمدنی کا یہ فرق 1960 میں 30:1 کا تھا جو 1997 میں بڑھ کر 74:1 کا ہوگیا۔[5] رپورٹ کے ان اعداد شمار کو اگر ہم سامراجی پالیسیوں یعنی سبز انقلاب اور نیو لبرل ایجنڈے سے جوڑ کر سمجھیں تو تیسری دنیا کے ممالک میں بڑھتی ہوئی غربت کی بنیادی وجہ ہم پر واضح ہوجائے گی۔ اس نظام کے اندر گندھے ہوئے ظلم کے نتیجے میں آج دنیا کی 16 فیصد آبادی[6] جو ترقی یافتہ ممالک میں رہتی ہے دنیا کے 80 فیصد وسائل استعمال کررہی ہے[7] اور دنیا کی 84 فیصد آبادی جو کہ تیسری دنیا میں مقیم ہے کے پاس دنیا کے صرف 20 فیصد وسائل کا استعمال ہے۔ اس مسئلہ کو اگر ہم اس لحاظ سے بھی جانچیں کہ دنیا کی سب سے زیادہ تنوع حیات رین فاریسٹس (rain forests) یعنی گھنے جنگلات جہاں کثرت سے بارش ہوتی ہے میں پائی جاتی ہے تو مسئلہ اور بھی گھمبیر ہو جاتا ہے۔ دنیا کے سب سے بڑے ٹروپیکل (tropical) رین فاریسٹس دنیا کے کل پانچ ممالک میں ہیں۔ جن میں برازیل، انڈونیشیا، کونگو، پیرو اور کولمبیا شامل ہیں۔ ان گھنے جنگلات میں پائے جانے والے جانور، پودے اور دیگر زندگی قدرتی وسائل کے بیش بہا ذخیرے ہیں۔ اس طرح دنیا میں پائے جانی والی تنوع حیات کی بیش بہا دولت دراصل تیسری دنیا میں ہے لیکن اس پر ترقی یافتہ ممالک نے کئی طریقے سے قبضہ کیا ہوا ہے۔ مثلاً 1983 میں ایف اے او نے پودوں کے جینیاتی مواد پر ایک کمیشن تشکیل دیا جس کو کمیشن برائے جینیاتی مواد (Commission on Genetic Resources) کا نام دیا گیا۔ یہ کمیشن جینیاتی مواد کے تحفظ اور فروغ کے لیے حکومتوں کے درمیان پہلا حکومتی فورم تھا۔ کمیشن کا پہلا اہم کام جینیاتی مواد کے حوالے سے بین الاقوامی سطح پر رضا کارانہ ذمہ داری کی قرار داد منظور کروانا تھا۔ اس قرار داد کا مقصد یہ تھا کہ پودوں کے جینیاتی مواد کی حالیہ اور متوقع معاشی اور سماجی اہمیت کی بنا پر، خاص طور پر زراعت کے حوالے سے افزائش اور دیگر تحقیقاتی منصوبے کے لیے کھوج، تحفظ اور فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔ اس کے پیچھے ایک بنیادی سوچ یہ تھی کہ پودوں کا جینیاتی مواد انسان کا مشترکہ ورثہ ہیں اس لیے اس کی فراہمی کو بغیر کسی رکاوٹ کے یقینی بنائیں۔[8] وسائل پر ان غیر منصفانہ اختیار کے ہتھکنڈوں اور استعمال کی وجہ سے اس نام نہاد ترقی نے تیسری دنیا کے لیے بھوک، غربت اور پسماندگی کے جو اندھیرے چھوڑے ہیں ان کو مندرجہ ذیل اعداد وشمار سے سمجھا جاسکتا ہے۔

1۔ ایک بلین لوگ بھوک کا شکار ہیں۔

2۔ ایک بلین لوگ صاف پانی سے محروم ہیں۔

3۔ 2.2 بلین لوگوں کے پاس بہتر نکاسی آب کی سہولیات نہیں۔

4۔ ایک بلین لوگ صحت کے مراکز اور 1.4 بلین لوگ بجلی سے محروم ہیں۔

5۔ تین بلین سے زائد لوگ روزانہ 2.5 ڈالر یا اس سے بھی کم پر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔[9]

جبکہ دوسری طرف وہ تمام تر غیر حقیقی ترقی جو عالمی اشرافیہ کے گرد ہوئی یعنی جدید صنعتی ترقی، جس کے پیچھے سرمایہ داری اور سامراجیت کی ہوس کارفرماں تھی کے نتیجے میں ماحولیاتی وسائل اور زیر زمین ایندھن کا بے دریغ استعمال بڑھتا گیا جس کے اثرات ماحول میں گرین ہاؤس گیسیز (کاربن ڈائی آکسائیڈ (CO_2)، میتھین (CH_4)، نائٹرس آکسائیڈ (NO_2)، اوزون (O_3) وغیرہ) کے بڑھتے ہوئے اخراج، حیاتیاتی تنوع کے خاتمے اور صنعتی آلودگی جیسے بڑے بڑے مسائل کی صورت میں سامنے آئے۔

گراف 1

زیر زمین ایندھن کے استعمال سے عالمی کاربن ڈائی آکسائیڈ (CO_2) کا اخراج 1990-2008

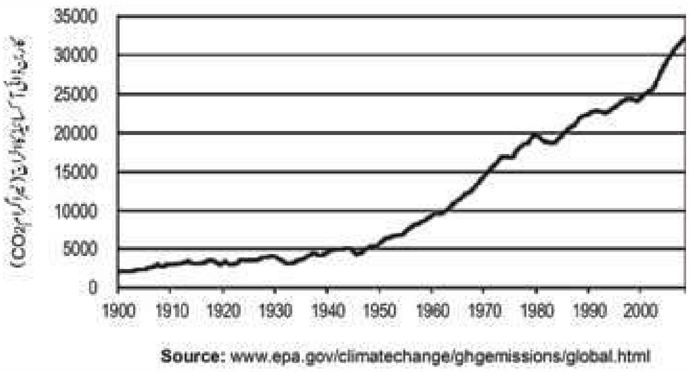

گراف 1 سے صاف ظاہر ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز سے لے کر اکیسویں صدی کے اوائل تک جو کہ زیادہ تر جدید صنعتی ترقی کا دور تصور کیا جاتا ہے میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کے اخراج میں تقریباً 30,000 ٹیرا گرام کا اضافہ ہوا۔ اس بنیاد پر ہم جدید صنعتی ترقی کو موجودہ ماحولیاتی بحران کی بنیادی وجہ کہہ سکتے ہیں۔

3۔ یو این ایف سی سی سی

جب ماحولیاتی بحران نے نام نہاد ترقی کی بنیادوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تو اس کا ذمہ دار ترقی یافتہ ممالک کو ٹھہرایا گیا۔ جس پر پہلی دنیا نے اس کی ذمہ داری تیسری دنیا میں بڑھتی ہوئی آبادی اور وہاں بسنے والی غریب عوام پر ڈالنے کی کوشش شروع کردی۔ ان کے مطابق چونکہ یہ آبادیاں اپنی زندگی کی تمام تر ضروریات قدرتی وسائل کے استعمال سے پوری کرتیں ہیں اس لیے ماحول کی تباہی کی ذمہ داری بھی ان پر عائد ہوتی ہے۔ جب کہ دوسری طرف تیسری دنیا کے ممالک اور عوام دوست تحریکوں نے گرین ہاؤس گیسیز (جن کا ایک بڑا حصہ کاربن ڈائی آکسائیڈ ہے) کے بڑھتے ہوئے اخراج کو جدید صنعتی ترقی سے جوڑتے ہوئے پہلی دنیا کے ممالک کو اس ماحولیاتی بحران کا ذمہ دار ٹھہرایا۔

اس ماحولیاتی بحران کے ذمہ دار ممالک کی نشاندہی کے حوالے سے پائیدار ترقی کے نام پر پہلی عالمی کانفرنس 1992 میں برازیل کے شہر ریو میں منعقد ہوئی جس میں ماحولیاتی بحران سے نکلنے کے لیے ٹھوس تجاویز پیش کی گئیں۔ اسی ضمن میں مشترک

لیکن الگ الگ ذمہ داریوں (Common But Differentiated Responsibilities/CBDR) کا اصول وضع کیا گیا۔ CBDR (سی بی ڈی آر) کے تحت تاریخی طور پر ماحولیاتی بحران کی ذمہ داری چونکہ ترقی یافتہ ممالک پر عائد ہوتی ہے اس لیے ماحولیاتی بحران کے حوالے سے بھی ہماری مشترکہ ذمہ داری کے ساتھ ساتھ ان ممالک کی زیادہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اس بربادی کا خمیازہ ادا کریں۔

اقوام متحدہ کا ادارہ یو این ایف سی سی سی جو موسمی تبدیلی کا کنونشن ہے کہ آرٹیکل نمبر 2 میں گرین ہاؤس گیسیز کے اخراج میں ٹھہراؤ لانے پر زور دیا گیا ہے۔ اس ادارے کے تحت 1997 میں جاپان کے شہر کیوٹو میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس کے نتیجے میں کیوٹو پروٹوکول طے پایا جس میں آرٹیکل نمبر3 کے تحت صنعتی ممالک کو قانونی طور پر پابند کیا گیا تھا کہ وہ 1990 کے سال کو بنیاد بناتے ہوئے گرین ہاؤس گیسیز کے اخراج میں 2008 سے 2012 تک کے دورانیہ میں مجموعی طور پر پانچ فیصد کمی لائیں گے۔ گرین ہاؤس گیسیز کے اخراج میں کمی کا تعین مشترک لیکن الگ الگ ذمہ داریوں کے اصول کے تحت کیا گیا تھا لیکن اس بحران کو منڈی پر مبنی تین طریقے کار کے تحت حل کرنے کی تجاویز پیش کی گئی۔

1۔ ایمیشن ٹریڈنگ (Emission Trading/ET) یعنی اخراج کی تجارت۔ اس طریقے کار کے تحت ملک کے مرکزی ادارے جو کہ عام طور پر ریاستی ادارہ ہوتے ہیں کسی بھی آلودہ کرنے والے عنصر کے ماحول میں زیادہ سے زیادہ اخراج کا تعین کرتے ہوئے پرمیٹس یا اجازت نامہ جاری کرتے ہیں۔ ان پرمیٹس کو پھر مختلف کمپنیاں رصنعتیں اپنی ضرورت کے مطابق خریدتی ہیں۔ اگر کسی کمپنی رصنعت کو عناصر کے اخراج کے لیے مزید پرمیٹس کی ضرورت ہے تو وہ کسی دوسری کمپنی رصنعت سے جن کا آلودہ کرنے والے عناصر کا اخراج کم ہو پرمیٹس خرید سکتی ہے۔ یعنی کہ اگر ہم اس طریقہ کار کو مزید گہرائی سے سمجھیں تو جس کمپنی رصنعت کے پاس زیادہ دولت ہے وہ اخراج کو جاری رکھ سکتی ہے اور جس کمپنی رصنعت کے پاس کم سرمایہ ہے وہ منڈی میں اپنی صنعتی پیداوار جاری نہیں رکھ سکتی۔ جس طرح محاورتاً کہا جاتا ہے کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتی ہے تو ہو بہو اس طریقے کار کے ذریعے بھی سرمایہ دار ممالک کی بڑی بڑی بین الاقوامی کمپنیاں چھوٹی صنعتوں کو خرید کر عالمی منڈی پر اپنی اجارہ داری کو مزید مضبوط بنا سکتی ہیں۔ جب اشیاء کی پیداوار کچھ ہی کمپنیوں کے ہاتھوں میں رہ جائے گی تو وہ اشیاء کے منہ مانگے دام لگا کر صارف سے نا صرف اپنے پرمٹوں کے دام واپس وصول لیں گی بلکہ اپنے منافع کی شرح بھی قائم رکھ پائیں گی۔

2۔ کلین ڈیولپمنٹ میکانیزم (Clean Development Mechanism/CDM) یعنی صاف ستھری ترقی کے طریقہ کار۔ سی ڈی ایم کے ذریعے وہ ممالک جن کو کیوٹو پروٹوکول کے تحت اپنے اخراج کی شرح کم کرنی ہے وہ تیسری دنیا کے ممالک میں پائیدار ترقی کی بنیاد پر کسی بھی قسم کا ترقیاتی پروگرام ترتیب دیتے ہیں۔ یعنی ایسے پروگرام جس میں کاربن کا اخراج کم سے کم ہو مثلاً کوئی صنعتی ملک پاکستان جیسے غریب ملک میں بجلی فراہمی کی اسکیم متعارف کرسکتا ہے۔ یہ بجلی کی فراہمی سورج کی روشنی پر مبنی سولار پینلز (solar panels) کے ذریعے یا پھر ونڈ ملز (wind mills) کے ذریعے کی جاسکتی ہے۔ اس طرح صنعتی ممالک تیسری دنیا کے ممالک میں محض پائیدار ترقیاتی پروگراموں کا خرچہ اٹھا کر نا صرف اپنی ٹیکنالوجی کو منتقل کرتے ہیں بلکہ اپنے ہاں گرین ہاؤس گیسیز کے اخراج کو جاری رکھنے کی اجازت بھی حاصل کرتے ہیں۔ اس اجازت نامہ کو سرٹیفائیڈ امیشن ریڈکشن (Certified Emission Reduction/CER) کریڈیٹ کہتے ہیں۔ ان کریڈیٹس کی قیمت کا تعین منڈی کرتی ہے جس میں ایک کریڈیٹ کی قدر کاربن ڈائی آکسائیڈ کے ایک ٹن کے برابر ہوتی ہے۔ اس طرح صنعتی ممالک اپنے کاربن کے اخراج میں کمی کے اہداف کو ان پروجیکٹس سے حاصل ہونے والے کریڈیٹ کے ذریعے پورا کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس طریقہ کار سے صنعتی ممالک ایمیشن ٹریڈنگ یعنی اخراج کی تجارت کو فروغ دے رہے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ اس طریقے کار سے ناصرف سرمایہ دار بدستور منڈی پر قابض رہ پا رہے ہیں بلکہ اب سبز معیشت پر مبنی اپنی نئی صنعتی مشینری و اشیاء کو تیسری دنیا میں بڑی کامیابی سے متعارف کروا رہے ہیں۔ CER (سی ای آر) کریڈیٹس کا ایک قابل غور نکتہ ان کے منڈی میں دام ہیں۔ مالیاتی بحران2008 سے پہلے تک ایک ٹن سی ای آر کریڈیٹ کی قیمت 20 ڈالر تھی۔ پچھلے سال یعنی 2012 میں اس کی قیمت گر کر کل تین ڈالر رہ گئی۔ یہ کاربن کریڈٹ اقوام متحدہ کے جاری کیے گئے ہوتے ہیں لیکن ان کے دام کا تعین منڈی کرتی ہے۔10

3۔ جوائنٹ امپلی مینٹیشن (Joint Implementation/JI) یعنی مشترکہ اطلاق۔ مشترکہ اطلاق اصل میں سی ڈی ایم سے بہت ملتا جلتا ہے۔ ان میں صرف ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ اس میں ایک صنعتی ملک اپنے کاربن کے اخراج میں کمی کے ہدف کو کسی دوسرے صنعتی ملک میں سرمایہ کاری اور ترقی کے منصوبوں کے ذریعے ممکن بنا سکتا ہے۔

کیوٹو پروٹوکول میں کاربن کے اخراج کو کم کرنے کے لیے ایک طرف ترقی یافتہ ممالک کی طرف سے کوئی سنجیدہ کوشش سامنے نہیں آئی تو دوسری طرف امریکہ نے

گراف 2

زیرزمین ایندھن کے استعمال سے کاربن ڈائی آکسائیڈ (CO_2) کے اخراج میں ممالک کا حصہ

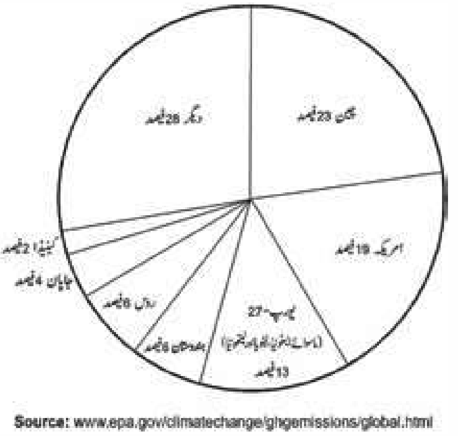

Source: www.epa.gov/climatechange/ghgemissions/global.html

اس معاہدے پر دستخط نہیں کیے۔ جس پر امریکی صدر بش نے سال 2000 میں یہ موقف اختیار کیا کہ اگرچہ وہ موسمی تبدیلی کو بہت سنجیدگی سے لیتے ہیں تاہم کیوٹو پروٹوکول پر دستخط نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں 80 فیصد دنیا کو مستثنیٰ قرار دے دیا گیا ہے۔ جس میں چین اور ہندوستان جیسے بڑے ممالک بھی شامل ہیں۔[11] اس طرز عمل سے امریکہ کی معیشت کو بھی شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

ممالک	آبادی[12]
چین	1.35 بلین
ہندوستان	1.26 بلین
امریکہ	317 ملین
یورپی یونین	500 ملین

چین اور ہندوستان میں دنیا کی تقریباً 36 فیصد عوام رہتی ہے جو کہ مجموعی طور پر 30 فیصد سے بھی کم کاربن کے اخراج کے ذمہ دار ہے۔ جبکہ دوسری طرف امریکہ اور یورپی یونین دنیا کی کل آبادی کا تقریباً 11.6 فیصد ہے لیکن یہ ممالک کاربن کے تقریباً 32 فیصد اخراج کے ذمہ دار ہیں۔

ماحولیاتی بحران کو حل کرنے کے لیے منڈی پر مبنی پیش کردہ تمام تر طریقے کار کے ذریعے اقوام متحدہ نے ایک بار پھر نجی کمپنیوں کے لیے نئی منڈیوں کے راستے ہموار کردیے ہیں۔ ان منڈی پر مبنی طریقے کار کا اگر تجزیہ کیا جائے تو سرمایہ دار ممالک نے ایک طرف اپنی صنعت کو رواں رکھتے ہوئے گرین ہاؤس گیسیز کے اخراج کو برابر جاری رکھا ہوا ہے اور دوسری طرف تیسری دنیا کے ممالک میں ''ماحول دوست پروجیکٹ'' کے ذریعے اپنی ٹیکنالوجی کی منتقلی کے راستے ہموار کرتے ہوئے کاربن کے اخراج کم کرنے کے اہداف حاصل کررہے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کے طرف سے اس غیر سنجیدہ رویے کے اثرات جہاں ایک طرف عالمی سطح پر سینڈی، فیٹ اور کیٹرینا طوفان کی صورتوں میں سامنے آرہے ہیں وہیں پر پاکستان میں سوپر فلڈ 2010، سندھ میں 2011 کی سیلابی بارشوں اور بالائی سندھ، بلوچستان اور جنوبی پنجاب میں 2012 کی تباہ کن بارشوں کی شکل میں۔ یہ تمام تر تلخ حقائق جس میں عوام کا بے انتہا جانی و مالی نقصان ہوا اقوام متحدہ کی انہی پالیسیوں کی عکاسی ہیں جس میں مفاد پرست عالمی اشرافیہ نے ماحولیاتی بحران کو سنجیدگی سے حل کرنے کے بجائے اس بحران کی آڑ میں نئی منڈیوں کے راستے ہموار کیے۔

4۔ پائیدار ترقی: ریو پلس 20

پائیدار ترقی کی تشریح یہ کی جاتی ہے کہ

> ''ایسی ترقی جو آج کی نسل کی ضروریات کو پورا کرتے ہوئے مستقبل میں آنے والی نسلوں کی ضروریات کو زد میں نہ لائے''۔

اس تناظر میں پائیدار ترقی کی پہلی عالمی کانفرنس کے 20 سال بعد برازیل کے شہر ریو میں 20 سے 22 جون، 2012 کو اقوام متحدہ کانفرنس برائے پائیدار ترقی (United Nations Conference on Sustainable Development/UNCSD) کا انعقاد ہوا جسے ریو پلس20 کا نام دیا گیا۔ اس کانفرنس میں پائیدار ترقی کو گرین ایکانومی یعنی سبز معیشت کے تحت تین ستونوں کی بنیاد پر پیش کیا گیا یعنی سماجی، معاشی اور ماحولیاتی۔ ماحولیاتی بنیاد پر ترقی کو وضع کرنے کی ضرورت ماحولیاتی بحران کی تناظر میں نکل کر سامنے آئی تھی۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ اس کی ذمہ داری تیسری دنیا نے گرین ہاؤس گیسیز کے بے تحاشا اخراج کی وجہ سے پہلی دنیا کے صنعتی ممالک پر عائد کی تھی جبکہ ترقی یافتہ ممالک نے ماحولیاتی بحران کو تیسری دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی اور غریب عوام سے جوڑ کر پیش کیا تھا۔ اسی بنیاد پر سبز معیشت کے ماڈل کو بھی پائیدار ترقی اور غربت کے خاتمے کے ساتھ پیش کیا گیا۔ ماحولیاتی بحران کے حل کے حوالے سے جس طرح کیوٹو پروٹوکول کے تحت بحران کو استعمال کرتے ہوئے سرمایہ کاری کے لیے نئی منڈیاں پیدا کی گئی تھیں، ہو بہو اس طرح پائیدار ترقی اور غربت کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہوئے نئی منڈیوں کو فروغ دیا جارہا ہے تاکہ ترقی یافتہ ممالک کی گرتی ہوئی معیشت پھر سے ''پائیدار بنیادوں'' پر استوار ہوسکے۔ اس کانفرنس کا اہتمام کرنے والوں نے دنیا بھر میں بھوک، غربت کے اعداد وشمار اور گرین ہاؤس گیسیز کے اخراج سے متوقع خدشات کی نشاندہی کرتے ہوئے سبز معیشت کے لیے وہ میدان تیار کیا جس میں پائیدار ترقی کے نام پر سرمایہ کاری کے لیے نئی منڈیاں پیدا کی گئی ہیں۔ ان اعداد وشمار کی تفصیل درج ذیل ہیں:13

1۔ 1.4 بلین لوگ یعنی ہر پانچ میں سے ایک شخص 1.25 ڈالر یومیہ زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔
2۔ 1.5 بلین کے پاس بجلی اور 2.5 بلین کے پاس ٹوائلٹ کی سہولت نہیں ہے اور تقریباً روزانہ ایک بلین لوگ بھوک کا شکار ہیں۔
3۔ گرین ہاؤس گیسیز کا اخراج بڑھ رہا ہے۔ اگر موسمی تبدیلی اس طرح ہی بڑھتی رہی تو دنیا سے تقریباً ایک تہائی حیات کا خاتمہ ہوجائے گا۔
4۔ اگر ان چیلینجز کو ابھی سنجیدگی سے نہ لیا گیا تو ہمیں مزید غربت، عدم استحکام اور تباہ حال کرہ ارض کا سامنا ہوگا۔

اس کانفرنس سے نکلنے والے مسودے ''آور کومن ویژن'' یعنی ہمارا مشترکہ تصور کے اندر اس غربت کے خاتمے کے لیے جو حقیقت میں انہی سامراجی قوتوں کی پیدا کردہ ہے کسی حقیقی سوچ اور انتظام کی جھلک نظر نہیں آتی۔ مسودے کے اندر غربت کے لفظ کو ابہام کے ساتھ استعمال کرتے ہوئے ایک طرف ترقی پزیر ممالک میں ماحول دوست ٹیکنالوجی کی منتقلی پر زور دیا گیا ہے جس کی عکاسی مسودے میں ترقی اور غربت کے خاتمے کے سیکشن III کے آرٹیکل 58 کے جز ایف (f) کے اندر کی گئی ہے۔ کیونکہ ترقی یافتہ ممالک کے مطابق غربت ماحول کی بربادی کی ایک بڑی وجہ ہے اس لیے ان کا خیال ہے کہ اس

بربادی کو ماحول دوست ٹیکنالوجی کے ذریعے روکا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف غربت کے خاتمے کے لیے وسائل پر اختیار کی بات نہیں کی گئی بلکہ اسی آرٹیکل میں ''ماحول دوست ٹیکنالوجیز'' کے استعمال کے لیے لوگوں کی صلاحیت بڑھانے پر زور دیتے ہوئے غربت کے خاتمے کا راستہ دیکھایا گیا ہے اور ان سب پر طرہ یہ ہے کہ ان ٹیکنالوجیز کی منتقلی عام استعمال کے بجائے عوام دشمن ذہنی ملکیت کے معاہدوں کے تحت ہوگی۔

اسی مسودے کے اندر تحفظ خوراک کے سیکشن میں آرٹیکل 118 کے تحت ترقی پزیر ممالک میں زراعت اور دیہی ترقی کے فروغ کے لیے آزاد تجارت کا راستہ دیکھایا گیا ہے۔ جس کے ذریعے عالمی تحفظ خوراک کو یقینی بنایا جائے گا۔ اسی طرح آرٹیکل 110 میں زراعت اور پائیدار طریقہ زراعت کو بڑھاتے ہوئے منڈیوں کے نظام کو بہتر بنانے پر زور دیا گیا ہے۔ جس میں دیہی انفرا اسٹرکچر، ذخیرہ کرنے کے انتظام، ویلیو چین (value chain) کے ذریعے دیہات اور شہر میں بہتر رابطے اور پیداوار کے بعد خوراک کے ضائع ہونے میں کمی پر زور دیتے ہوئے سرکاری اور نجی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

اسی سیکشن میں پھر زمین، ماہی پروری اور جنگلات کو ملکی تحفظ خوراک کے تناظر میں پیش کرتے ہوئے زمین پر معینہ مدت تک کے اختیار کے لیے رہنما اصولوں (Voluntary Guidelines on the Responsible Governance of Tenure of Land, Fisheries and Forests) کو استعمال کرتے ہوئے قانون سازی کرنے کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ یہ رہنما اصول بھی اقوام متحدہ کے ادارے ایف اے او کے زیر سایہ بنائے گئے ہیں۔ ان پیش کردہ رہنما اصولوں کو اگر ہم مشرف کے دور میں منظور ہونے والے کارپوریٹ فارمنگ آرڈیننس 2001 سے جوڑ کر سمجھیں تو اس کے ذریعے ملکی زرعی زمین کو بیرونی سرمایہ کاری کے لیے 99 سال کی لیز پر دیا جاسکتا ہے۔ اس آرڈیننس کے تحت لینڈ گریبنگ (land grabbing) یعنی زمینوں پر غیر ملکی کمپنیوں کے قبضے کے اثرات دیہی آبادیوں پر زمین سے بے دخلی کی صورت میں سامنے آرہے ہیں۔ اس ضمن میں

میرپور خاص کی کیس اسٹڈی کو چیلینج کے اسی شمارے میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

5۔ حیاتیاتی تنوع کا کنونشن

پائیدار ترقی کے حوالے سے ماحولیاتی تنوع کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اقوام متحدہ نے حیاتیاتی تنوع پر کنونشن کو مئی 1992، نیروبی، کینیا میں مکمل کرتے ہوئے جون میں ارتھ سمٹ 1992 جو برازیل کے شہر ریو میں منعقد ہوئی تھی دستخط کے لیے پیش کیا۔ اس کنونشن کے تین بنیادی مقاصد تھے۔

1۔ حیاتیاتی تنوع کا تحفظ۔

2۔ حیاتیاتی تنوع اور اس کے اجزاء کا پائیدار استعمال۔

3۔ حیاتیاتی وسائل کی بنیاد پر حاصل ہونے والے فوائد کا منصفانہ تبادلہ۔

اس کنونشن کے آرٹیکل نمبر 16 میں ٹیکنالوجی یعنی بائیوٹیکنالوجی تک رسائی اور منتقلی کی بنیاد پر ملکوں کے مابین جینیاتی ردو بدل سے تیار کردہ جانداروں کی تجارت کے حوالے سے ایک معاہدہ طے پایا جسے کارٹیجینا پروٹوکول (Cartagena Protocol) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ پروٹوکول 29 جنوری، 2000 میں مونٹریال، کینیڈا میں منظور کیا گیا۔ اس معاہدے کا بنیادی مقصد انسانی صحت اور ماحول کو بائیوٹیکنالوجی کے ممکنہ خطرات سے بچانا اور اس کے ساتھ جدید بائیوٹیکنالوجی کی افادیت کو انسانی بہتری خاص کر کے خوراک، زراعت اور صحت کے حوالے سے تسلیم کرتے ہوئے ملکوں کے مابین تجارتی اصول وضوابط کو طے کرنا تھا۔ وہ ترقی یافتہ ممالک جن کے پاس یہ ٹیکنالوجی تھی ان کی شہ پر اقوام متحدہ نے ایک بار پھر حیاتیاتی تنوع کے کنونشن کے تحت پہلے بائیوٹیکنالوجی کے لیے جگہ پیدا کی اور پھر اس بائیوٹیکنالوجی کی منتقلی کے لیے کارٹیجینا پروٹوکول کے ذریعے ملکوں کے مابین منڈیوں کے راستے ہموار کیے۔ مزید یہ کہ اس غیر فطری طریقے سے تیار کردہ مصنوعات کی منتقلی کو بھی ذہنی ملکیت کے معاہدوں کے ذریعے تحفظ دے کر سامراجیت کے تسلط کو یقینی بنایا۔

جینیاتی ردو بدل سے تیار کردہ جاندار حیاتیاتی تنوع کے لیے ممکنہ خطرہ

حیاتیاتی تنوع کے اس کنونشن میں جینیاتی ردو بدل سے تیار کردہ جانداروں کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے فروغ دیا گیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس غیر فطری طریقے سے تیار کردہ جاندار حیاتیاتی تنوع کے لیے بذات خود ایک بہت بڑا خطرہ ثابت ہوسکتے ہیں۔ گو کہ اس کو ثابت کرنے کے لیے کوئی آزادانہ سائنسی تحقیق میسر نہیں تاہم اگر ہم اس نقطے کو غذائی زنجیر کے حوالے سے سمجھیں جس میں بہت چھوٹے جانداروں سے لے کر چرند، پرند اور حیوانات سب ایک دوسرے کی خوراک کا حصہ بنتے ہیں تو یہ جاندار (جینیاتی ردو بدل سے تیار کردہ جاندار) غذائی زنجیر میں رکاوٹ ثابت ہوتے ہوئے ایک بہت بڑی حیات کے خاتمے کا باعث بن سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر بی ٹی کپاس جو غیر فطری طریقے سے ایک خاص زہریلے جراثیم اور کپاس کے باہم ملاپ سے تیار کی گئی ہے جب کھیت میں کاشت کی جاتی ہے تو اس کے پودے نا کپاس کے ہوتے ہیں اور نا ہی جراثیم کے۔ نتیجتاً کپاس سے وابستہ تمام تر حیات جو ایک طرف کپاس کے پودے سے براہ راست اپنی خوراک حاصل کرتی ہے کا مطلوبہ خوراک کے نا ہونے کی وجہ سے خاتمہ ممکن ہے تو دوسری طرف غذائی زنجیر سے جڑی ہوئی وہ تمام تر حیات جو ان جانداروں کو اپنی خوراک بناتی ہے کی تعداد اور صحت متاثر ہونے کا خدشہ ہے۔ اس کی عام فہم مثال ہماری دیہی آبادیوں کے مشاہدے کے مطابق یہ ہے کہ اگر بی ٹی کپاس کا بنولہ دودھ دینے والے جانوروں مثلاً بھینس کے لیے بطور خوراک استعمال کیا جائے تو یہ بنولہ جانور کے دودھ کم دینے یا پھر اس کی موت میں اضافے کی ممکنہ وجہ بنتا ہے۔ اس بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس غیر فطری طریقہ ایجاد سے مربوط غذائی زنجیر میں جانداروں کے لیے خوراک کی عدم دستیابی کی وجہ سے حیاتیاتی تنوع محدود سے محدود تر ہونے کا اندیشہ ہے۔

اس تمام تر بحث کو اگر سمیٹا جائے تو اقوام متحدہ اور اس کے ذیلی اداروں نے اپنی پالیسیوں کے ذریعے سامراجیت اور سرمایہ داری کے تسلط کو مزید گہرا کرنے کے لیے تیسری دنیا کے عوام اور وسائل کو ہمیشہ استحصال کے لیے پیش کیا ہے۔ اقوام متحدہ کے ادارے ایف اے او نے خوراک کے تحفظ کا نظریہ پیش کیا تو سبز انقلاب کی پالیسی نے اس کو استعمال کرتے ہوئے جس سامراجی بیج کو فروغ دیا وہ ایک طرف تو ماحولیاتی بحران کا پیش خیمہ بنا تو دوسری طرف طبقاتی تفریق میں اضافے کی وجہ۔ وسائل پر غیر منصفانہ اختیار جس کی تاریخ نوآبادیاتی نظام سے جڑی ہوئی ہے کی بنیاد پر پیش کردہ سبز انقلاب کی پالیسی نے جہاں مقامی سطح پر جاگیرداری کو مضبوط کرتے ہوئے عوام کو غربت کے اندھیروں میں دھکیلا تو عالمی سطح پر پہلی دنیا اور تیسری دنیا کی تفریق کو مزید گہرا کیا۔ مقامی اور عالمی دونوں سطحوں پر اسی تفریق کو قائم رکھتے ہوئے جب بھی کسی پالیسی کو پیش کیا گیا تو اس کے فوائد اور اثرات بھی طبقاتی فرق کے ساتھ سامنے آئے۔ اقوام متحدہ کی کسی بھی پالیسی کو اگر دیکھا جائے تو وہ بہت انسان دوست اور انصاف پر مبنی نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر خوراک تک رسائی کا معاشی پہلو یا پھر نیولبرل ایجنڈے کے تحت آزاد تجارت کی پالیسی۔ خوراک تک رسائی کو اگر طبقاتی فرق کے ساتھ سمجھیں تو اس پالیسی کی حقیقت جہاں جاگیردار اور کسان مزدور کے لیے بالکل مختلف ہے اسی طرح ترقی یافتہ اور ترقی پزیر ممالک کے لیے آزاد تجارت کا معاہدہ بالکل دو متضاد چیزیں ہیں۔ کیونکہ خوراک تک رسائی مزدور کی قوت خرید سے جڑی ہوئی ہے جو کہ دوسری طرف آزاد معیشت میں ''سستے سے سستے'' مزدور پالیسیوں پر مبنی ہے۔ یقیناً جہاں آٹے کی قیمت تقریباً ''40'' روپے فی کلو اور مزدور کی یومیہ دیہاڑی 200 روپے ہو تو خوراک تک رسائی کیوں کر ممکن ہوسکتی ہے؟

پائیدار ترقی کے حوالے سے اگر گرین ایکانومی کی پالیسی کو ہی لیا جائے تو ایک طرف اس میں سماجی برابری اور مشترکہ شمولیت (Inclusiveness) کا اصول اپنایا گیا ہے اور پھر اسی اصول کو بنیاد بناتے ہوئے آزاد تجارت کا راستہ ہموار کیا گیا ہے۔ جس میں دیہی انفرا اسٹرکچر، ذخیرہ کرنے کے انتظام اور ویلیو چین جیسے اقدامات کو بہتر بنانے پر زور دیتے ہوئے ترقی کے تناظر میں پیش کیا جارہا ہے۔ اس اصول کا مطلب یہ ہوا کہ منڈی میں حصہ اور اختیار بھی پھر فرد اور ملک کی حیثیت سے ہوگا۔ یعنی جس کے اختیار میں جتنے وسائل ہوں گے اتنی ہی وہ ترقی کرسکے گا۔ نتیجتاً اس نظام کے تحت امیر امیر تر ہوتا جائے اور غریب غریب تر۔ دوسری طرف عوام کے لیے وسائل پر اختیار کی کوئی بات نہیں کی جارہی بلکہ طبقاتی تفریق جیسے ناہموار میدان کو برقرار رکھتے ہوئے غربت کے خاتمے جیسے نعرے کو پیش کیا جارہا ہے۔ جس میں پہلی دنیا تیسری دنیا میں ذہنی ملکیت کے معاہدوں کے تحت ٹیکنالوجی کی منتقلی کے لیے میدان ہموار کررہی ہے۔ اسی ناہموار میدان کی بنیاد پر زمین پر معینہ مدت تک کے اختیار کے رہنما اصولوں کو غیرملکی سرمایہ کاری کے تحفظ کے لیے ''انصاف'' کے تقاضوں سے ہم آہنگ بنا کر پیش کیا جارہا ہے۔ اس ظالمانہ نظام کے تحت اس نام نہاد انصاف کے معنی ان کسان مزدور آبادیوں کے لیے کچھ اور ہیں جنہیں زمینوں سے بے دخل کیا جارہا ہے اور سرمایہ دار کمپنیوں کے لیے کچھ اور۔ اسی طرح سی جی آئی اے آر کا قیام جس میں بین الاقوامی سرمایہ دار قوتوں نے باہم گٹھ جوڑ کیا۔ اس گٹھ جوڑ کا مقصد سائنسی زرعی تحقیق اور جینیاتی مواد پر قبضہ جماتے ہوئے مستقبل کی زراعت کو اپنے ہاتھ میں کرنا اور کسانوں کو محتاج کرنا تھا۔ اس سے جڑا ہوا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اقوام متحدہ کے حیاتیاتی تنوع کے کنونشن کے ذریعے ان ہی بائیوٹیک مصنوعات (جو جینیاتی مواد کو استعمال کرتے ہوئے تیار کی گئی تھی) کی افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے جو میدان تیار کیا گیا اس کو کارٹیجینا پروٹوکول کے ذریعے سرمایہ دار قوتوں نے اپنے مفاد میں حتمی شکل دیتے ہوئے ذہنی ملکیت کے معاہدوں کے تحت ملکوں کے مابین تجارت کے اصول وضوابط کو طے کردیا۔ اقوام متحدہ کے اس دوستانہ چہرے کے پیچھے سامراجیت کی طرف ایک ایسا جھکاؤ ہے جس نے عوام کو بین الاقوامی کمپنیوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا ہے۔ اقوام متحدہ کا کردار اس وقت تک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے جب تک وہ اس طبقاتی تفریق جو انسانوں اور ملکوں دونوں کے بیچ ہے ختم کرتے ہوئے انصاف کی بنیادوں پر پائیدار ترقی کا راستہ ہموار نہیں کرتی۔

حوالہ جات

1. Stavrianos, "Global rift the third world comes of age" William Morrow and Company, INC. L.S. New York. 1981, p. 443.
2. Mousseau, Frederic. "Food aid or food sovereignty?" p. 12.
3. Harvey, Paul et al. "Food aid and food assistance in emergency and transitional contexts: a review of current thinking". Humanitarian Policy Group, Overseas Development Institute, UK, June, 2010, pp. 46-47.
4. CIMMYT سی آئی ایم وائی ٹی International Maize and Wheat Improvement Centre
IRRI آئی آر آر آئی International Rice Research Institute
ICTA آئی سی ٹی اے International Centre for Tropical Agriculture
IITA آئی آئی ٹی اے International Institute of Tropical Agriculture
5. IBON. "IBON primer on system change: monoply capitalism and the ecological crises". IBON International, 2012, p. 9.
6. Porter, G. and Brown, J., "Global environmental politics", Westview Press, 1991, p. 128.
7. Soubbotina, Tatyana P and Sheram, K. "Beyond economic growth: meeting the challenges of global development. The World Bank Group, 2000, p. 18. accessed from www.worldbank.org/depweb/beyond/beyondco/beg_03.pdf.
8. Sullivan, Shawn N. "Plant genetic resources and the law: past, present, and future". Plant Physiology 2004 May; 135(1), 10-15. accessed from http://www.ncbi.nlm.nih.gov/pmc/articles/
9. IBON. "IBON primer on system change: monoply capitalism and the ecological crises". IBON International, 2012, p. 9.
10. Harvey, Fiona. "Global carbon trading system has 'essentially collapsed'. The Guardian, 10 September, 2012, accessed from http://m.guardian.co.uk/environment/2012/sep/10
11. Hovi, Jon et al. "Why the United States did not become a party to the Kyoto Protocol: German, Norwegian and US perspectives. European Journal of International Relations, 18 (1) 129-150, 2010. accessed from http://www.uni-potsdam.de/u/sprinz/doc/Hovi.2012.
12. www.geohive.com/earth/population_now.aspx
13. IBON. "IBON primer on the United Nations Conference on Sustainable Development (Rio+20)" IBON International, 2012, pp. 2-3.

پاکستان میں جینیاتی زراعت کے فروغ کے لیے چال بازی:

امریکی سرکار اور اس کی سرمایہ دار زرعی بائیوٹیک کمپنیوں کا گٹھ جوڑ

تحریر: ولی حیدر

صنعتی زراعت کے آغاز سے ہی زراعت میں تحقیق اور ترقی کا تمام تر دائرہ کار پیداوار بڑھانے اور اس کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ منافع کمانے پر مرکوز ہے۔ پیداوار بڑھانے اور منافع کمانے کے اس عمل میں زراعت کا کاروبار کرنے والی بین الاقوامی کمپنیاں پیش پیش ہیں۔ سبز انقلاب سے لے کر جینیاتی انقلاب تک کا سفر بھی اسی محور کے گرد گھومتا ہے۔ کچھ دہائیوں سے زراعت میں جینیاتی انجینئرنگ کے ذریعہ زرعی پیداوار بڑھانے کی طرف پیش رفت شروع ہوئی۔ تقریباً پچھلے آٹھ سالوں میں پاکستان میں بھی اس حوالے سے بازگشت سننے میں آرہی ہے جب چند جاگیرداروں نے غیر قانونی طور پر جینیاتی کپاس کی کاشت شروع کردی جیسے حرف عام میں بی ٹی کپاس کہا جاتا ہے۔ چونکہ پاکستان میں بیج پر ذہنی ملکیت کے معاہدے کے حوالے سے قانون سازی کے مراحل اب تک جاری ہیں، اس لیے بیج کی بین الاقوامی کمپنیوں خاص طور پر مونسانٹو نامی امریکی کمپنی کو اپنی مخصوص بی ٹی کپاس کی بیج کو فروغ دینے میں مشکلات کا سامنا ہے۔

جینیاتی انجینئرنگ کے ذریعے پیداوار خاص طور پر خوراک کی پیداوار پر دنیا بھر میں اور پاکستان میں بھی سخت منفی جذبات پائے جاتے ہیں کیونکہ اس عمل سے کئی سنگین مسائل جڑے ہوئے ہیں۔ ڈبلیو ٹی او کے ذہنی ملکیت کے معاہدے ٹرپس (Trade-related intellectual Property Rights/TRIPs) کے ذریعہ بیج جس میں جینیاتی انجینئرنگ سے تیار شدہ بیج شامل ہے، پر بڑی بڑی بین الاقوامی کمپنیوں کا کل اختیار ہے۔ قانون کے حوالے سے اب بیج بنانے والے کو سند دی جاتی ہے جس کے ذریعے وہ اس بیج کو پیدا کرنے، فصل تیار کرنے اور بیچنے کا کل اختیار رکھتا ہے۔ ٹرپس کے معاہدے کی ایک بنیادی وجہ بیج اور خاص کر کے جینیاتی بیج کو بڑی بڑی بین الاقوامی کمپنیوں کے قبضہ میں دینا تھا۔ یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ کسان کا بیج پر اختیار ختم ہوتے ہی ساری دنیا ہمیشہ کے لیے زراعت اور خوراک کے لیے ان کمپنیوں کی تابع ہوجائے گی۔ اس کے علاوہ مزاحمت و تنقید کی ایک بنیادی اصولی و اخلاقی وجہ جینیاتی انجینئرنگ کے ذریعے کسی جاندار شئے کا غیر قدرتی طریقے سے تیاری ہے جس کے انسانی صحت، ماحول اور زمین پر پڑنے والے اثرات کا اندازہ لگانا ابھی تک ناممکن ہے۔ اس کائنات کے وجود سے لے کر پچھلی کچھ دہائیوں تک روایتی طور پر جین کی منتقلی (دوسرے لفظوں میں افزائش نسل) ایک ہی طرح کی جاندار شئے کے درمیان ہوا کرتی تھی جو کہ 100 فیصد قدرت کے اختیار میں تھی۔ جینیاتی انجینئرنگ اس قدرت کے ارتقائی عمل میں مداخلت کرتے ہوئے لیبارٹری میں ٹیکنالوجی کے ذریعے جین کی منتقلی دو مختلف اقسام کے جانداروں کے درمیان کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ یورپ میں اخلاقی پہلوؤں کے علاوہ اس ٹیکنالوجی کے سائنسی پہلوؤں پر بھی بھرپور تنقید ہورہی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس سائنس میں بنیادی کمزوریاں اور نقص موجود ہیں جو وجہ تنقید اور تشویش ہیں۔ عوامی سائنسی گروہوں کی اس مزاحمت کو مدنظر رکھتے ہوئے نہ صرف بیج کی بین الاقوامی کمپنیاں بلکہ پہلی دنیا کے ترقی یافتہ ممالک خاص طور پر امریکہ جینیاتی جانوروں، جینیاتی فصلوں اور اس سے جڑی دیگر غذائی اشیاء کی پیداوار کو بڑھانے کے لیے مختلف ترکیبیں ترتیب دینے میں مصروف ہیں۔ انہی میں امریکی زرعی محکمہ یعنی یونائیٹڈ اسٹیٹس ڈیپارٹمنٹ آف ایگریکلچر (USDA) کی پاکستان کے حوالے سے زراعت پر سالانہ رپورٹ[1] یہ سمجھنے میں مدد دیتی ہے کہ امریکہ اور اس کی آلہ کار زرعی اور بائیوٹیکنالوجی بین الاقوامی کمپنیوں کا پاکستان کے حوالے سے آئندہ کا کیا لائحہ عمل ہے۔

USDA (یوایس ڈی اے) کی یہ رپورٹ پاکستانی زراعت میں بائیوٹیک یا جینیاتی فصلوں کے حوالے سے زمینی حقائق کا تجزیہ پیش کرتی ہے۔ اس رپورٹ کے کلیدی نکات اور ایگزیکٹیو سمری کا مکمل ترجمہ اور اس کے علاوہ رپورٹ کے مختلف حصوں کا کچھ ترجمہ نیچے پیش کیا جارہا ہے۔ رپورٹ کے اہم مندرجہ جات کا تجزیہ مضمون کے آخر میں پیش کیا جائے گا۔

کلیدی نکات

حکومت پاکستان نے 2012 میں سرکاری طور پر بی ٹی کپاس کی آٹھ (MON531)[2] اور عام (conventional) کپاس کی چھ اقسام کی کاشت کی منظوری دے دی ہے۔ جبکہ بائیوٹیکنالوجی کے لیے تدبیری ڈھانچہ (framework) اور ضروری قانون سازی موجود ہے۔ نئی بائیوٹیک فصلوں کی جانچ اور نگرانی کی صلاحیتوں کو (بڑھانے کا عمل) پچھلے سال کلیدی منسٹریوں کی تحلیل کے بعد روک دیا گیا تھا۔ پاکستان میں بیج کے لیے قانون یعنی سیڈ ایکٹ (Seed Act) اور اگانے والوں کے حقوق یعنی پلانٹ بریڈرز رائٹس ایکٹ (Plant Breeders' Rights Act) کے حوالے سے قانون سازی پر عمل درآمد اب بھی ایوان

میں زیر التوا ہے۔ روایتی ویکسینز (vaccines) اور کچھ تولیدی مادوں (genomes) پر تحقیق کے علاوہ جانوروں پر مبنی جینیاتی انجینئرنگ کا عمل بہت کم ہے۔

سیکشن I ایگزیکٹیو سمری

پاکستان میں انتظامیہ اور کسان عموماً بائیوٹیکنالوجی کو اپناتے ہیں۔ حکومت پاکستان نے 2012 میں بی ٹی کپاس (MON 531) کی آٹھ اور عام (conventional) کپاس کی چھ اقسام کی کاشت کی منظوری دے دی ہے۔ اس وقت کئی جینیاتی فصلوں پر کام ہو رہا ہے جن میں سرکاری/نجی/بین الاقوامی بیج کی کمپنیاں حصہ لے رہی ہیں۔

کپاس پر مجموعی زیر کاشت رقبہ (8.5 ملین ایکڑ) کے تقریباً تین ملین ہیکٹر [3] [7.4 ملین ایکڑ] پر بی ٹی کی مختلف قسمیں کاشت ہو رہی ہیں۔ تمام شعبے مثلاً فصلوں کی مربوط تجربہ گاہیں، جینیاتی حفاظتی عمل کا جائزہ (biosafety evaluation) اور ذہنی ملکیت کے حقوق کے لیے نظام موجود ہیں۔

پاکستان میں بائیوٹیکنالوجی کے حوالے سے امریکہ کی زرعی تجارت میں اولین دلچسپی اس وقت کپاس، مکئی، سویابین اور جانوروں کی خوراک (animal feed) کے حوالے سے ہے۔

پاکستان میں ایسا کوئی قانون نہیں جو کہ جینیاتی مصنوعات (مثلاً بڑے پیمانے پر زرعی اشیاء، تیار کھانے کی اشیاء (bulk agricultural commodities, snack foods and processed items) کی درآمد کو روک سکے۔

پاکستان نے جینیاتی تحفظ کے حوالے سے کارٹیجینا پروٹوکول (Cartagena Protocol) کی توثیق کی ہوئی ہے اور جینیاتی مصنوعات کی دیکھ بھال کے لیے تدبیری ڈھانچہ بنایا ہوا ہے۔

بیج کا کاروبار کرنے والی بین الاقوامی کمپنیاں جینیاتی کپاس، مکئی اور سرسوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لیے تیزی کے ساتھ سرگرداں ہیں۔

پاکستان میں زرعی بائیوٹیکنالوجی کے لیے سرکاری نظم ونسق کا باضابطہ (official regulatory) فریم ورک موجود ہے لیکن اس کے باوجود نجی سرمایہ کار شعبہ کو بائیوٹیکنالوجی کی طرف مائل کرنے کی صلاحیت ابتدائی مراحل میں ہے۔ پلانٹ بریڈرز رائٹس ایکٹ اور سیڈ ایکٹ 1976 میں تبدیلیاں (amendments) ابھی تک پارلیمان سے منظوری کا انتظار کر رہی ہیں۔ یہ مسئلہ اس لیے زیادہ التوا میں چلا گیا ہے کہ پچھلے سال منسٹریاں جن میں بائیوٹیکنالوجی پر مبنی پودوں اور جانوروں کی منسٹریاں بھی شامل تھیں تحلیل کر دی گئیں۔

جینیاتی جانوروں کے حوالے سے جینومکس (ڈی این اے کی فنگر پرنٹنگ/ DNA finger printing) اور مال مویشیوں کے لیے حفاظتی ٹیکے کا کام بڑھ رہا ہے، جبکہ جانوروں کی کلوننگ (cloning) پر کام ابھی سوچ بچار (planning) کی مراحل میں ہے۔ کچھ کام ایمبریو ٹیکنالوجی کی منتقلی (Embroyo Transfer Technology) پر ہو رہا ہے۔[4]

سیکشن II پلانٹ بائیوٹیکنالوجی کی تجارت اور پیداوار

بائیوٹیک فصلوں کی کاروبار کے لیے پیداوار

- جینیاتی کپاس (MON 531) کو پاکستان میں ذہنی ملکیت یا پٹینٹ (patent) کا تحفظ حاصل نہیں ہے، مگر اسے بڑے پیمانے پر حکومتی اور مقامی نجی کمپنیوں نے پاکستانی مقامی کپاس کے ملاپ سے پیدا (cross breed) کیا ہے۔ پچھلے سال پنجاب سیڈ کونسل (PSC) نے بی ٹی کپاس کی نو قسموں کو پنجاب میں کاشت کے لیے منظور کیا۔
- پاکستان میں زیر کاشت بی ٹی کپاس قدرتی طور پر پھیلنے والی اقسام میں سے (open pollinated varieties) ہے، اس لیے یہ بیج اگلے سال بھی کاشت کی جا سکتی ہے۔ بیج کی مقامی کمپنیاں بی ٹی کی اس قسم کو بڑھانے کے لیے روایتی طریقہ اختیار کرتی ہیں۔ بیج کی منظوری، تیاری اور رجسٹریشن کا مرکزی محکمہ، قومی وزارت برائے تحفظ خوراک اور تحقیق، حکومت پاکستان (Federal Seed Certification and Registration Department/FSC&RD) کرتی ہے۔

زیر ترقی بائیوٹیکنالوجی فصلیں

پچھلے سال ادارہ برائے ماحولیاتی تحفظ (EPA) کی قومی بائیوسیفٹی کمیٹی نے جینیاتی فصلوں کے 104 الگ الگ کیسیز (cases) کی مختلف حوالے سے اجازت دے دی۔ ان میں وہ کیسیز شامل ہیں جن پر تحقیق کا عمل لیبارٹری میں، گرین ہاؤسیز اور کھیت میں لگی فصلوں پر جاری ہے۔

- جینیاتی فصلوں کے محکمہ کے تحقیقی شعبہ نے جینیاتی انجینئرنگ کے مختلف پہلوؤں پر ضروری اشیاء مثلاً کپاس، مکئی، چاول، گندم، گنا اور مونگ پھلی کے حوالے سے مہارت حاصل کر لی ہے۔ جینیاتی فصلوں کی پہلی نسل (سنگل جین پر مبنی) ترقی کے کافی آگے کے مراحل میں ہے

جبکہ دوسری نسل (2 سے 5 جینز پر مبنی) ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔5
کیری لوگر بل (Kerry Lugar Bill) کے تحت پاکستان اور امریکہ کے درمیان جینیاتی گندم اور کپاس کی پیداوار بڑھانے کا پروجیکٹ بہتر طور پر آگے بڑھ رہا ہے۔

- انتہائی شدید مالی بحران کے باوجود حکومتی شعبہ زرعی جینیاتی ترقی کے لیے ابھی تک خاطر خواہ مالی امداد فراہم کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر اعلیٰ تعلیم ہائیر ایجوکیشن کمیشن (Higher Education Commission /HEC) اور پنجاب زرعی تحقیقی بورڈ (Pakistan Agricultural Research Board/PARB) جینیاتی فصلوں کی پیداوار کے لیے کافی مالی امداد فراہم کر رہے ہیں۔ یہ انتہائی حوصلہ افزاء امر ہے کہ کئی منصوبے جینیاتی گندم پر ہیں جو کہ مقامی لوگوں کے لیے روز مرہ کی خوراک کا ذریعہ ہے۔ بال گارڈ II (Bollgard II) اور راؤنڈ اپ ریڈی فلیکس (Roundup Ready Flex) (جو کہ جڑی بوٹیوں کے خاتمہ کے لیے ہوتا ہے) کے ساتھ ساتھ گرمی برداشت کرنے والی مکئی بھی آزمائشی مراحل میں ہے اور توقع ہے کہ ضروری کاروائیوں کے مکمل ہوتے ہی یہ اقسام جلد جاری کر دی جائیں گی۔

فصلوں اور بائیوٹیکنالوجی اشیاء کی درآمد

- پاکستان امریکہ اور دیگر ذرائع سے بڑے پیمانے پر کپاس درآمد کرتا ہے جس میں سے زیادہ حصہ بی ٹی کپاس کا ہوتا ہے۔ پاکستان جی ایم (جینیاتی) کپاس، کنولہ اور مکئی کی بیج کئی ملکوں کی بین الاقوامی کمپنیوں سے درآمد کرتا ہے جن میں امریکہ، آسٹریلیا، کینیڈا، جرمنی، برازیل اور ہندوستان شامل ہیں۔ درآمدی منظوری ان بین الاقوامی کمپنیوں کو پانچ سال کے عرصہ کے لیے دی گئی تھیں۔
- سرکاری شعبہ سے بڑے ادارے مثلاً پنجاب سیڈ کارپوریشن اور پاکستان زرعی تحقیقی کونسل (Pakistan Agricultural Research Council/PARC) اسلام آباد نے جینیاتی کپاس کی ایسی اقسام کی درآمد سلور لینڈ بائیوٹیک کمپنی، چائنا (Silver Land Biotech Company, China) سے کی جو قدرتی عمل زیرگی (pollination) کے طریقہ سے پیدا کی گئی تھیں اس کے علاوہ جینیاتی ہائبرڈ کپاس کی بیج فارم نمبر 148، یانگ (Farm No.148, Xiaiang) سے درآمد کی گئی۔ پاکستان جینیاتی سرسوں کنولار ریپ سیڈ اور سورج مکھی کے بیج کینیڈا اور آسٹریلیا سے درآمد کرتا ہے۔ امریکی سویابین تیل جو کہ بائیوٹیک سویابین سے حاصل کیا جاتا ہے بھی پاکستان درآمد کرتا ہے۔

خوراک کی امداد

جینیاتی کھانوں کو خوراک کی امداد کی مد میں (پاکستان) لانے سے جڑے کوئی مسائل نہیں ہیں۔
خوراک کی امداد حاصل کرنے والے ممالک میں سے پاکستان ایک بڑا ملک ہے۔

سیکشن III پودوں کی بائیوٹیکنالوجی کے لیے پالیسی

الجھے ہوئے سیاسی مسائل۔ ذہنی ملکیت کے حقوق اور بیج پر پالیسی

- پاکستان کا موجودہ سیڈ ایکٹ کافی پرانا اور فرسودہ ہونے کے ساتھ ساتھ صرف حکومتی سطح پر بیج کا کاروبار کرنے والی کمپنیوں تک محدود ہے۔ سیڈ ایکٹ میں پیش کردہ تبدیلیاں قومی سطح پر دیگر سینٹرز میں تحقیق اور ترقی کو فروغ اور نجی کمپنیوں تک جینیاتی مواد کی منتقلی یقینی بناتی ہیں۔
- مجوزہ تبدیلیوں میں بیج کی غیر قانونی خرید و فروخت پر جرمانہ اور دیگر سزا دینے والے اقدامات تجویز کیے گئے ہیں۔
- پلانٹ بریڈر رائٹس ایکٹ کے ذریعہ مختلف قسموں کی بیج کی رجسٹریشن اور حق ملکیت پر دیے جانے والے معاوضہ (royalties) کی ادائیگی، جو کہ ڈبلیو ٹی او کے ذہنی ملکیت کے معاہدے ٹرپس کے تحت پاکستان کی ذمہ داری بھی ہے کو پورا کرنے میں مدد ملے گی۔ اس قانون کے تحت کسان اپنی بیج ایک دوسرے سے تبادلہ کر سکتے ہیں مگر کاروباری بنیاد پر فروخت نہیں کر سکتے۔ اس قانون کی منظوری میں تاخیر بیج کی بین الاقوامی کمپنیوں کے لیے پاکستان میں سرمایہ کاری میں سب سے بڑی رکاوٹ تصور کی جاتی ہے۔ بیج کے قانون کی منظوری میں ہچکچاہٹ کی ایک وجہ بیج کی منڈی میں سرکاری غلبے کو برقرار رکھنا ہے۔ اس کے علاوہ متوقع سرمایہ کار اس بات پر پریشان ہیں کہ کیا موجودہ زیرغور مسودے کے تحت ان کے ذہنی ملکیت کے حقوق پوری طرح محفوظ ہو پائیں گے۔

منظور شدہ بائیوٹیکنالوجی فصلیں

- بین الاقوامی کمپنیاں مونسانٹو (Monsanto)، پائنیر (Pioneer) اور سنجنٹا (Syngenta) جینیاتی مکئی کی کھیت میں لگی فصلوں پر جانچ پڑتال (فیلڈ ٹیسٹنگ) میں مصروف ہیں جبکہ مونسانٹو، ناتھ سیڈر گارڈ (Nath

(Seed/Guard اور بائیر (Bayer) بی ٹی کپاس کی فیلڈ ٹیسٹنگ میں مصروف ہیں۔

- پاکستان میں بال گارڈ II (اسٹیکٹ جین ٹیکنالوجی / stacked gene technology) بیج کی ذہنی ملکیت مونسانٹو نے حاصل کرلی ہے۔ جس کے نتیجہ میں اس ٹیکنالوجی کو استعمال کرنے والی بیج کی دیگر کمپنیوں کو مونسانٹو سے لائسنس حاصل کرنے کے اقدامات کرنے پڑیں گے۔ امید ہے کہ اس کے نتیجے میں اس مخصوص قسم کی بیج کی چوری میں کمی واقع ہوگی۔ حکومت پاکستان نے ایسی جینیاتی پیداوار جس کی منظوری ابھی نہیں دی گئی ہو کے نتیجہ میں منفی اثرات مرتب ہونے پر کسی تیسرے فریق کو معاوضہ دینے پر رضا مندی کا اظہار کیا ہے۔[6]

بائیوٹیکنالوجی فصلوں کی فیلڈ ٹیسٹنگ

- بائیوٹیکنالوجی فصلوں کی جانچ بال گارڈ II کپاس اور آر آر فلیکس کپاس (ہربیسائیڈر/جڑی بوٹی مار زہر برداشت کرنے والی قسم) کے علاوہ بی ٹی/ایچ ٹی (HT) مکئی کے لیے بھی ہورہی ہے اور امید کی جارہی ہے کہ اگلے سال ان کو منظور کردیا جائے گا۔

اسٹیکٹ واقعات کے ساتھ سلوک (Treatment of Stacked Events):

نیشنل بائیوسیفٹی کمیٹی نے لاہور کے سینٹر آف ایکسلنس ان مولیکیولر بائیولوجی کو کپاس میں اسٹیکٹ جین[7] (Cry 1A and Cry 2Ab) کی اقسام تیار کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ کئی اور اسٹیکٹ جین اشیاء ابھی تیاری کے عمل سے گزر رہی ہیں اور خیال کیا جاتا ہے کہ ان کو جلد ہی منظوری کے لیے پیش کردیا جائے گا۔

(جینیاتی اور غیر جینیاتی) فصلوں کی آپس میں ساتھ رہنے پر پالیسی سازی

ابھی تک گورنمنٹ آف پاکستان (GOP) نے جینیاتی اور غیر جینیاتی فصلوں کے آپس میں ساتھ اگنے پر پالیسی سازی نہیں کی ہے۔

بند ڈبوں میں آنے والی انسانوں اور جانوروں کی غذا کے بارے میں ڈبوں پر تحریری معلومات (Labelling of Packaged Foods or Feed)

بند ڈبوں میں آنے والے انسانوں اور جانوروں کے لیے غذا جو کہ جینیاتی کھانوں، جینیاتی اضافی اشیاء اور جینیاتی فصلوں سے تیار کردہ ہے کہ بارے میں پاکستان نے اب تک کوئی فیصلہ سازی نہیں کی ہے۔ جینیاتی اشیاء سے بنا ہوا کھانے کا تیل اور خوراک بغیر کسی روک ٹوک کے درآمد ہورہا ہے۔ ملک میں درآمدی اور برآمدی جینیاتی اشیاء کی جانچ پڑتال کے لیے سہولیات (testing facilities) موجود ہیں جو کہ مختلف گاہک (درآمد اور برآمد کرنے والے) استعمال کررہے ہیں۔

بائیوٹیکنالوجی کے حوالے سے تجارت کو رکاوٹیں

- پاکستان نے حال ہی میں جینیاتی کپاس کی آٹھ اور عام کپاس کی چھ اقسام کی کاروباری پیداوار کے لیے پنجاب اور سندھ میں منظوری دی ہے لیکن اس کے باوجود ایسی کوئی رکاوٹ (ban) نہیں ہے کہ جینیاتی کپاس کو برآمد کرکے اس سے مزید اشیاء نا بنائی جاسکیں۔ اس کے علاوہ کسی بھی قسم کی جینیاتی اشیاء پر روک ٹوک نہیں ہے چاہے وہ جینیاتی تیل ہو یا غذا (meal)۔ جینیاتی مکئی سے بھی جانوروں کے لیے غذا (biotech feed corn) بنائی جاسکتی ہے جسے پاکستان لانے پر پابندی نہیں۔ سویابین اور دیگر کھانے والے تیل جو کہ جینیاتی تیل والے بیجوں (oil seeds) یا دیگر جینیاتی اشیاء سے حاصل کیے جائیں پر بھی کوئی پابندی نہیں۔

پاکستان کا سیڈ ایکٹ، پلانٹ بریڈرز رائٹس ایکٹ اور قرنطیہ (quarantine)[8] کے لیے قوانین میں تاخیر پاکستان میں مادی (physical) اور ذہنی (intellectual) سرمایہ کاری کے لے رکاوٹیں ہیں۔ بین الاقوامی کمپنیاں اور مقامی نجی کمپنیاں بیج کی صنعت میں تعمیر (infrastructure) اور تحقیق و ترقی (research and development) جیسے عوامل جس سے جینیاتی فصلوں کو فروغ ملے، میں سرمایہ کاری کرنے سے گھبراتی ہیں۔

بائیوٹیک فصلوں کی کاروباری پیداوار کے لیے قانون سازی

ایک باضابطہ نظام اور قانون سازی موجود ہے لیکن ان مختلف فصلوں کے حوالے سے جو کہ پاکستان میں زیر ترقی ہیں کام کرنے والے سائنس دانوں کی قانون سازی، باضابطہ نظام اور پالیسی کے مسائل میں صلاحیت بڑھانے کی ضرورت ہے۔

سیکشن IV پودوں کی بائیوٹیکنالوجی کے منڈی میں بکنے (marketing) کے حوالے سے مسائل

منڈی میں بائیوٹیک اشیاء کی قبولیت

امریکی زرعی اور تیار شدہ اشیاء کی برآمد پاکستان میں بڑھ رہی ہے اور

سماج کا ہر طبقہ ان کو بہت قبولتا ہے۔

حکومت پاکستان اور زرعی ادارے بائیوٹیکنالوجی کے حمایتی ہیں۔ صنعت اور صارفین جینیاتی سویابین، سویابین غذا (meal)، سویا تیل اور دیگر تیار شدہ کھانوں (processed food products) کو بغیر کسی مخالفت کے قبولتے ہیں۔ پاکستان میں غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) نے زرعی جینیاتی ٹیکنالوجی کے خلاف آواز بلند کی ہے مگر یہ موضوع خاطر خواہ عوامی توجہ حاصل نہ کر سکا۔

پاکستان کی زرعی آبادی جینیاتی ٹیکنالوجی کے استعمال کی طرف داری کرتی ہے تاکہ پیداوار بڑھ سکے۔ اس کا ثبوت ہے کہ تقریباً تین ملین ہیکٹر زرعی زمین پر سال 2012/13 میں کپاس کی کاشت جینیاتی کپاس کی اقسام پر مشتمل ہے۔

سیکشن V پودوں کی بائیوٹیکنالوجی میں صلاحیت اور پہنچ بڑھانا
(Plant Biotechnology Capacity Building and Outreach)

حکومت امریکہ یا یوایس ڈی اے کی حالیہ مالی تعاون کی سرگرمیاں

زرعی بائیوٹیکنالوجی کے شعبہ میں کپیسٹی بلڈنگ اور آوٹ ریچ کے حوالے سے امریکی حکومت کے مالی تعاون سے سرگرمیاں درج ذیل ہیں:

- سال 2010/11 کے دوران یوایس ڈی اے نے گندم میں پائے جانے والے Ug 99، کپاس میں پتہ مروڑ وائرس اور جانوروں میں فٹ اینڈ ماؤتھ ڈیزیز (FMD) یعنی منہ کھر جیسے امراض سے لڑنے کے لیے 20 ملین ڈالر کا منصوبہ متعارف کیا۔
- سال 2009/10 کے دوران گندم میں پائے جانے والے اسٹم رسٹ (stem rust) اور FMD (ایف ایم ڈی) پر عالمی کانفرنسیں منعقد کروائیں۔ اس کے علاوہ یوایس ڈی اے نے پاکستان میں بائیوٹیکنالوجی فریم ورک کی تشکیل میں مدد فراہم کرنے میں بھی دلچسپی ظاہر کی۔
- تین ملکی (پاکستان، افغانستان اور امریکی) اشتراکی عمل میں بائیوٹیکنالوجی پر مالی امداد کو اہم شعبہ تصور کیا جاتا ہے۔ مئی 2009 میں پاکستانی وزیر زراعت کی سربراہی میں ایک وفد نے واشنگٹن کا دورہ کیا جس میں بائیو ٹیکنالوجی کے حوالے سے تین ملکی اشتراک پر تبادلہ خیال ہوا۔
- 2009 میں چھ افراد پر مشتمل بیج ٹیکنالوجی گروپ اور مزید چھ افراد پر مشتمل ڈیری (dairy) جینیاتی گروپ نے کوک رین (Cochran) پروگرام میں شرکت کی۔
- 2009 میں تین سائنسدانوں نے CIMMYT (سمیٹی) میکسیکو سے بورلوگ پروگرام (Borloug Programm) کے تحت گندم اسٹم رسٹ پر صلاحیت حاصل کی۔
- 2003 میں PL-480 خوراک برائے ترقی منصوبہ کے تحت یوایس ڈی اے فیصل آباد زرعی یونیورسٹی کو زرعی بائیوٹیکنالوجی کے مسائل پر تحقیق کے لیے مالی مدد فراہم کرے۔
- PARC (پی اے آر سی) سے منسوب ینگ (نوجوان) سائنٹسٹ پروگرام کے تحت بائیوٹیکنالوجی اور اس سے جڑے زرعی مسائل پر پوسٹ ڈاکٹریٹ (Postdoctoral) حقیقی مقالہ کے لیے مالی مدد فراہم کی جائے گی۔
- پاکستان - امریکی سائنس اور ٹیکنالوجی پروگرام کے تحت 7.5 ملین ڈالر پر مبنی ایک میمورینڈم آف انڈر سٹینڈنگ (MoU) پر دستخط ہوئے ہیں۔ MoU (ایم او یو) میں HEC (ایچ ای سی)، پاکستان سینٹر آف سائنس و ٹیکنالوجی اور امریکی ایگریکلچرل ریسرچ سروس (ARS) شریک ہیں۔ اس ایم او یو کا مقصد سائنسی تعاون اور سائنس دانوں کی صلاحیتوں کو بڑھانا ہے۔
- ایچ ای سی اور منسٹری آف سائنس اور ٹیکنالوجی کے ساتھ پاک- امریکی پروجیکٹ USNAS (یوایس این اے ایس) کے زیر سایہ جینیاتی فصلوں کی ترقی کے لیے تین سے پانچ پروجیکٹس چل رہے ہیں۔
- PARC (پی اے آر سی)، اسلام آباد کے تحت زرعی لینکیجیز (Linkages) پروگرام اور فیکلٹی ڈیولپمنٹ، ٹیکنالوجی ٹرانسفر اینڈ پروڈکٹ کمرشلائزیشن کے حوالے سے زرعی یونیورسٹی، فیصل آباد میں ایسے رواں پروجیکٹس کے لیے مالی امداد جو بائیوٹیکنالوجی کے ذریعہ فصلوں اور مویشیوں میں بہتری لائیں۔

یوایس ڈی اے کی پاکستان زرعی بائیوٹیکنالوجی رپورٹ کا تجزیہ

اگر ہم اوپر دی گئی رپورٹ (کے ترجمے) کا تنقیدی جائزہ لیں تو پاکستانی زراعت میں امریکہ اور دیگر بین الاقوامی کمپنیوں کے آئندہ کے لیے بھیانک عزائم واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ سب سے پہلا اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ امریکی سرکار جینیاتی زراعت کے شعبے میں اپنی بین الاقوامی کمپنیوں کے تحفظ کے لیے خود آگے بڑھ کر ایک کلیدی کردار ادا کر رہی ہے۔

پاکستان پر جینیاتی زراعت کے حوالے سے بڑی باریک بینی سے کئی شعبہ جات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان میں شامل ہیں۔

1۔ جینیاتی انجینئرنگ کے حوالے سے پاکستان میں موجودہ قانون سازی۔
2۔ بین الاقوامی ذہنی ملکیت کے معاہدوں کی بنیاد پر پاکستان میں قانون سازی کے حوالے سے پیش رفت مثلاً ٹرپس اور کارٹیجینا پروٹوکول۔
3۔ جینیاتی انجینئرنگ کے حوالے سے پاکستانی حکومت کے دیگر ادارے اور حکمت عملی کے لیے مختلف ڈھانچے۔
4۔ جینیاتی تحقیق کے حوالے سے مختلف سائنسی اداروں کی نشاندہی اور ان کے سائنس دانوں کی صلاحیتوں کا جائزہ۔

5۔ جینیاتی اجناس اور دیگر جینیاتی اشیاء جن پر ابھی پاکستان میں تحقیق جاری ہے۔

6۔ جینیاتی انجینئرنگ کے حوالے سے امریکی امدادی کاروائی۔

7۔ ان تمام شعبہ جات، اداروں اور عمل درآمد سے زرعی بین الاقوامی کمپنیوں پر اثرات۔

مندرجہ بالا نکات امریکی سرکار اور اس کی منافع خور بین الاقوامی زرعی بائیوٹیکنالوجی کمپنیوں کے آگے کے لائحہ عمل کو سمجھنے میں مدد دے سکتے ہیں۔

پاکستان میں جینیاتی اجناس اور امریکی جینیاتی کمپنیوں کے مفادات

جیسا کہ رپورٹ میں کہا گیا کہ امریکہ سمیت دیگر کمپنیوں کی جینیاتی فصلوں کی پیداوار بڑھانے پر واضح پیش رفت نظر آرہی ہے۔ ان فصلوں میں نہ صرف نقد آور فصلیں مثلاً کپاس اور چاول بلکہ ہماری خوراک کی ضرورت کو پورا کرنے والی انتہائی اہم ترین فصلیں، گندم، چاول اور مکئی ان کی اولین ترجیح میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی جانوروں کی خوراک کے حوالے سے بھی نظریں ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امریکی سرکار زراعت میں بائیوٹیکنالوجی کو کیوں اہمیت دے رہی ہے؟

سرمایہ کاری کو ترغیب دینے والے اداروں کے مطابق موسمی تبدیلی اور اناج کے ذخائر کم ہونے کی وجہ سے خوراک کی قیمتوں میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ اس لیے زراعت اور خوراک کے شعبے میں سرمایہ کاری انتہائی سود مند ہے۔ اسی حوالے سے مختلف سرمایہ کار ادارے سرگرم عمل ہیں جن میں شکاگو بورڈ آف ٹریڈ (Chicago Board of Trade) امریکہ بھی شامل ہے، جو مکئی، گندم، سرسوں اور چاول کی تجارت کو فروغ دینے میں مصروف عمل ہے۔ یہی وہ اجناس ہیں جن پر زرعی بین الاقوامی کمپنیاں پاکستان میں تحقیق اور فروغ کا کام کر رہی ہیں۔ یو ایس ڈی اے کی پاکستانی زرعی بائیوٹیکنالوجی میں شدید دلچسپی اور تحقیق کا فروغ، پاکستان کی عوام کی بہتری کے لیے نہیں بلکہ اپنی جینیاتی اور زرعی اشیاء کی درآمدات اور ان کی منڈی کے فروغ کے لیے ہے۔

اعداد و شمار سے یہ واضح نظر آتا ہے کہ بیج کا کاروبار کرنے والی بین الاقوامی کمپنیاں بیش بہا منافع کمانے میں مصروف ہیں۔ بیج کا کاروبار کرنے والی دنیا کی دس بڑی کمپنیوں میں سے چار کا تعلق امریکہ، پانچ کا تعلق یورپ جبکہ ایک کا تعلق جاپان سے ہے۔ 2009 میں ان 10 کمپنیوں کی مجموعی آمدنی 27,400 ملین ڈالر تھی جو دنیا کی مجموعی بیج کے کاروبار کا 73 فیصد ہے یہ حصہ 2007 میں 67 فیصد تھا۔ 2009 کے مجموعی حصہ میں سے صرف مونسانٹو کے پاس ہی 27 فیصد اور ڈیوپونٹ (Dupont) کے پاس 17 فیصد تھا۔[9]

اسی طرح عام خرید و فروخت کرنے والی 10 بڑی جینیاتی کمپنیوں میں سے آٹھ کا تعلق امریکہ سے اور بقیہ دو کا تعلق برطانیہ اور آسٹریلیا سے ہے۔ اس فہرست میں پہلی پانچ بڑی کمپنیاں امریکی ہیں جن میں مونسانٹو دنیا کے دوسرے نمبر پر ہے۔ جینیاتی کمپنیوں کی مجموعی آمدنی جو کہ 91.7 بلین ڈالر ہے کا 62 فیصد دنیا کی صرف دس کمپنیوں کے پاس ہے۔[10] جینیاتی طور پر مال مویشیوں کا کاروبار کرنے والی 17 بڑی کمپنیوں میں سے 14 کا تعلق یورپ، دو کا تعلق امریکہ جبکہ ایک کا تعلق کینیڈا سے ہے۔[11]

ڈبلیو ٹی او کے چھٹے وزارتی اجلاس کے موقع پر جنوبی کوریا کے کسان لی کیونگ ہائے (Lee Kyung Hae) نے یہ کہہ کر خودکشی کر لی کہ "ڈبلیو ٹی او کسان کی جان لے رہا ہے" (WTO Kills Farmers)۔ ڈبلیو ٹی او کے دو معاہدے یعنی ٹرپس ذہنی ملکیت کا معاہدہ اور عالمی زراعتی معاہدہ (Agreement on Agriculture/AoA) ہیں جن کو ڈھال بنا کر ترقی یافتہ ممالک اور ان کی کمپنیاں تیسری دنیا کے ملکوں کے قوانین میں ترامیم کر رہی ہیں تاکہ ان کمپنیوں کی مقامی منڈیوں تک رسائی آسان ہو جائے۔ 2000 کی دہائی میں امریکی وزارت زراعت نے کئی بار ڈبلیو ٹی او کے دیگر اجلاسوں میں عالمی زرعی منڈیوں میں امریکی زرعی اشیاء کی رسائی کے لیے اپنی کاوشوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ مثال کے طور پر امریکی وزیر زراعت این وینامن نے ڈبلیو ٹی او کے دوحہ اجلاس 2001 سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"…. ہم مستقل اس کوشش میں سرگرداں ہیں کہ عالمی منڈی میں امریکی کسانوں کی قوت مقابلہ مضبوط تر ہو جائے۔ یقیناً مستقبل میں امریکی زراعت کو فروغ اسی صورت میں مل سکتا ہے جب امریکہ کی رسائی عالمی منڈیوں تک آسان ہو جائے۔ عالمی زراعتی معاہدے میں شامل نئے نئے برآمدی مواقعوں کی وجہ سے امریکہ کے لیے گندم، کپاس، گوشت اور دیگر تیار کھانوں کی رسائی دنیا کی مارکیٹ تک آسان ہو جائے گی …."۔[12]

صرف دو سال ہی کے بعد این وینامن نے کین کون، میکسیکو میں ہونے والے ڈبلیو ٹی او کے پانچویں وزارتی اجلاس کے لیے کہا: "دوحہ راؤنڈ… جہاں بات چیت کا آغاز ہوا تھا کا کامیاب اختتام دنیا بھر کے لیے اور خاص کر کے مقابلہ پسند امریکی کسانوں کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ اس لیے کہ غیر ملکی منڈیوں تک رسائی امریکی زراعت کے لیے ایک زیادہ معاشی مستقبل تعمیر کرنے میں مدد دے گی۔ سب سے تیز بڑھنے والے مارکیٹس اب ترقی پذیر ممالک میں ہیں جہاں پر ایک متوسط طبقہ (middle class) سامنے آرہا ہے جن کی قوت خرید بڑھ رہی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ 2020 تک، اجناس اور گوشت کی مانگ کا 85 فیصد حصہ ترقی پذیر ممالک سے ہوگا"۔[13]

جینیاتی جانوروں، فصلوں اور دیگر اشیاء کے لیے پاکستان میں قانون سازی

پاکستان کی زراعت میں پودوں، جانوروں اور دیگر اشیاء کے حوالے سے قانون سازی

کے مراحل کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ منسٹریوں کے تحلیل ہونے سے لے کر ریگیولیٹری (regulatory) اداروں کی نشاندہی کی جارہی ہے۔ پھر نئے قوانین کے ذکر کے ساتھ پرانے قوانین میں ترامیم پر بھی نظر ہے۔ ان ترامیم سے غیر ملکی کمپنیوں کو ہونے والے فوائد اور نقصان کا تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

دوسری طرف ان ساری جینیاتی فصلوں، اجناس اور بیجوں کا ذکر ہے جو کہ اس وقت پاکستان میں زیرِ تحقیق ہیں۔ ان تحقیق کے مراحل کو سرکاری اداروں اور غیر ملکی نجی کمپنیوں کے حوالے سے بھی بانٹا گیا ہے کہ سرکاری شعبہ کیا کررہا ہے اور نجی شعبہ کیا۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی قوانین مثلاً ٹرپس اور کارٹیجینا پروٹوکول کا بھی پاکستان کے بائیوٹیکنالوجی قوانین کے حوالے سے ذکر ہے۔ ساتھ ساتھ نشاندہی بھی کردی گئی ہے کہ ایک حد تک جینیاتی اشیاء کے لیے قوانین میں تاخیر کی ایک وجہ پاکستانی سرکار خود ہے جو مکمل طور پر اس شعبہ پر اختیار کھونا نہیں چاہتی۔

یہ نوٹ کرنا ضروری ہے کہ جینیاتی شعبے میں باضابطہ قوانین کے لیے بھی امریکی سرکار امداد دینے میں اپنی رضامندی دکھا رہی ہے۔

رپورٹ کے حوالے سے ایک شدید تشویش ناک پہلو ہے کہ سرمایہ کاروں خاص طور پر بیج کی بین الاقوامی کمپنیوں کا پاکستانی قانون سازی پر واضح اثر نظر آرہا ہے۔ سرمایہ کاروں کے نکتہ نظر سے جب تک کمپنیوں کے مفاد میں قانون سازی نہ کی جائے ان کے سرمایہ کو خطرہ لاحق ہے۔ سیڈ ایکٹ کی شق کہ کسان بیج کی خرید و فروخت نہیں کرسکیں گے جو کہ دراصل اس کے مالک ہیں، مگر کمپنیوں کو کھلا اختیار ہوگا کہ وہ اس کا کاروبار کریں۔ یہ دوغلی اور تضاد پر مبنی شق ہے جسے حکومت پاکستان کو فوراً نکالنا چاہیے۔ یہ قانون دراصل حقیقی مالک جو کہ صرف اور صرف کسان ہیں کے اختیار کو محدود کرتا ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ اگر کسان اپنی بیج کو فروخت کرنا چاہے تو اسے روکا جائے اور کمپنیوں کو اس تجارت میں کھلی چھوٹ حاصل ہو؟

یہی وہ شق ہے جس کی بنیاد پر ڈبلیو ٹی او میں تیسری دنیا اور پہلی دنیا میں شدید ترین اختلاف ابھر کر سامنے آئے اور "WTO out of Agriculture" یعنی ''ڈبلیو ٹی او کو زراعت سے باہر نکالو' کا معروف نعرہ وجود میں آیا۔ ڈبلیو ٹی او کے زرعی اور ذہنی ملکیت کے معاہدے دراصل زراعت کے پیداواری ذرائع خصوصاً بیج پر سرمایہ داروں کے قبضہ کو لاگو کرنے کے سنگین آلے ہیں جن کے ذریعہ بین الاقوامی کمپنیاں ایک طرف ہمارے بیجوں اور ساتھ ساتھ اعلیٰ نسل کے جانوروں کے جینیاتی مواد پر قابض ہوجائیں گی۔ دوسری طرف ہمارے ہی جینیاتی مواد کو استعمال کرتے ہوئے ہماری منڈیوں کو اپنی تیار کردہ غذائی اشیاء سے بھر دیں گی اور اس طرح برآمدات اور درآمدات دونوں کو زیادہ سے زیادہ منافع کے حصول کے لیے استعمال کریں گی۔ بائیوٹیکنالوجی کو آج یوں پیش کیا جارہا ہے کہ یہی وہ ایک واحد ٹیکنالوجی ہے جو کہ زراعت کو جدید رنگ دے کر دنیا کو بھوک و افلاس سے بچا سکے گی۔ سائنس دان لیبارٹریوں میں بنائی جانے والی ناقص، خطرناک خوراک و دیگر اجناس اور جاندار کو انسانی زندگی اور ماحولیات میں متعارف کرائے جارہے ہیں، بغیر اس احساس ذمہ داری کہ یہ ٹیکنالوجی تنوع حیات پر شدید ضرب لگا سکتی ہے اور لگا رہی ہے۔ ابھی حال میں ہی فرانس سے ایک تحقیقی رپورٹ مونسانٹو کے راؤنڈ اپ ریڈی ہربیسائیڈ کے چوہوں کی صحت پر سنگین اثرات کی ترجمانی 14 ہے ناکہ ہم ان تجربات سے کچھ سیکھ کر اس قدر بھیانک سائنس سے پیچھے ہٹیں، ہماری سرکار اور سائنس دان کھلے عام بائیوٹیکنالوجی کی حمایت کرتے نظر آتے ہے۔ مثال کے طور پر کراچی یونیورسٹی میں قائم انٹرنیشنل سینٹر فار کیمیکل اینڈ بائیولوجیکل سائنسیز کے پروفیسر ڈاکٹر ایم اقبال چودھری نے حال ہی میں بڑے زور شور سے جینیاتی فصلوں کو فروغ دینے کی رائے دی ہے۔15 ان کے مطابق ملک میں غذائی کمی اور عدم تحفظ کو جینیاتی فصلوں اور بائیوٹیکنالوجی سے پورا کیا جاسکتا ہے۔ مزید یہ کہ خوراک کی بائیوٹیک فصلیں ملک میں زرعی پیداوار اور آمدنی بڑھا سکتی ہیں۔ اس طرح دنیا کے چھوٹے اور وسائل کی کمی کے شکار کسانوں کی حالت بہتر ہوسکتی ہے۔ ان کے الفاظ نا صرف ہمارے خطے کے کسانوں بلکہ دنیا کے تمام کسانوں کی سالہا سال محنت پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چھوٹے کسانوں کا صدیوں پر محیط تجربہ، دانش اور علم ہی ہے جس کے ذریعہ انہوں نے لاکھوں قسم کی بیج نہ صرف تیار کی بلکہ اسے اس انداز میں سنبھالا کہ آنے والی تمام نسلیں اس طریقہ کار کو اپناتے ہوئے اپنے لیے بیج کے ساتھ ساتھ خوراک کی خود کفالت حاصل کرسکیں۔

ایک اہم اور سنگین مسئلہ جس کی رپورٹ میں نشاندہی کی گئی ہے وہ جینیاتی طریقہ سے مال مویشیوں کے فروغ کے حوالے سے ہے۔ جس طرح رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ جانوروں کی کلوننگ پر بھی کام ہورہا ہے۔ کلوننگ کے موضوع پر دنیا بھر میں شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں اور اس کی مزید تحقیق پر زور دیا جارہا ہے مگر پاکستان جیسے تیسری دنیا کے ملک میں جانوروں پر کلوننگ جیسے کام کا انکشاف اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ عالمی سرمایہ کار منافع کے حصول کی خاطر پاکستان میں بھی اپنے پنجے گاڑنے کے ارادے رکھتے ہیں۔ مال مویشی کی کئی بہترین اقسام پاکستان میں پائی جاتی ہیں جن کی جینیاتی پیداوار کی طرف امریکی سرکار کے اقدام اس رپورٹ میں جھلک رہے ہیں۔

اعداد و شمار سے صاف ظاہر ہے کہ چاہے وہ بیج کا کاروبار ہو چاہیے وہ مال مویشیوں کا، عالمی طور پر چند بین الاقوامی کمپنیوں کا ہی قبضہ ہے اور سال بہ سال ان کمپنیوں کے منافع میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ دوسری طرف ڈبلیو ٹی او کے زیر اثر عالمی معاشی اصلاحات انہی کمپنیوں کے مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے ترتیب دیے جاتے ہیں۔ ٹرپس معاہدے کو ڈبلیو ٹی او میں زبردستی شامل کروانے میں امریکی بائیوٹیکنالوجی صنعت کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ پاکستان بھر میں جینیاتی کپاس میں پائے جانے والا جینیاتی مواد امریکی بین الاقوامی کمپنی مونسانٹو کا استعمال کیا گیا ہے جس کو MON 531 کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یو ایس ڈی اے کی زیر

بحث رپورٹ کے مطابق MON 531 پاکستانی سرکاری اور نجی کمپنیوں دونوں نے اپنی بنائی ہوئی بی ٹی کپاس کی قسموں میں استعمال کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ حکومت امریکہ اور اس کی کمپنی نے سوچے سمجھے ارادوں کے تحت اس جینیاتی مواد کے حوالے سے ٹرپس کے معاہدے کی خلاف ورزی پر کوئی اقدامات نہیں اٹھائے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس خاموشی کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ امریکہ جینیاتی بیجوں کے استعمال کو پاکستان میں عام کرنا چاہتا ہے تاکہ آنے والے وقتوں میں اس کو بنیاد بناتے ہوئے اپنے مطلب کے قوانین لاگو کروا سکے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بین الاقوامی کمپنیوں کی طرف سے تجویز کردہ تمام اصلاحات چاہے وہ سیڈ ایکٹ میں ہو یا پلانٹ بریڈرز رائٹس ایکٹ میں، تمام کے تمام صرف کمپنیوں کے تحفظ کو یقینی بناتے ہیں۔ مثال کے طور پر مونسانٹو کمپنی نے حکومت پاکستان سے یہ شرط قبول کروانے کی پوری کوشش کی ہے کہ اس کی بیج اگر ''غیر قانونی'' طور پر کسانوں کی زمین پر لگی ہوئی پائی گئی تو حکومت پاکستان کو 12 سے 15 ڈالر فی ایکڑ جرمانہ دینا پڑے گا۔ اب پاکستان اور اس کے تمام چھوٹے بڑے کسانوں کے لیے یہ شدید لمحہ فکریہ ہے۔ جیسا کہ یہ رپورٹ نشاندہی کررہی ہے کہ کپاس کے کل زیر کاشت رقبے 8.5 ملین ایکڑ میں سے 7.4 ملین ایکڑ (یعنی 88 فیصد حصے) پر صرف جینیاتی کپاس لگی ہوئی ہے۔ اب جبکہ جینیاتی بیج کے استعمال کی روایت قائم ہوگئی ہے تو آنے والے وقتوں میں مونسانٹو کمپنی اپنی بیج کے غیر قانونی استعمال پر جرمانہ لگوا کر بھاری منافع کمانے کے لیے زمین ہموار کررہی ہے۔ نوٹ کیا جائے کہ رپورٹ میں واضح طور پر نشاندہی کی گئی ہے کہ ''جینیاتی کپاس (MON 531) کو پاکستان میں ذہنی ملکیت کا تحفظ حاصل نہیں ہے''۔ اگر مونسانٹو مستقبل میں MON 531 کو پاکستان میں ذہنی ملکیت کا تحفظ دلوانے میں کامیاب ہوجائے تو کسانوں کو بھاری جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔ بہرکیف اگر کسانوں کا رجحان مستقل جینیاتی بیج کے استعمال کی طرف بڑھتا گیا تو اس کو چاہے ذہنی ملکیت کے کھاتے میں، یا جرمانے کے کھاتے میں اپنی انتھک محنت کا ایک بڑا حصہ مونسانٹو اور دیگر بیج کی کمپنیوں کو دینا پڑے گا۔ خیال رہے کہ یہی کچھ نا صرف تیسری دنیا کے غریب کسانوں کے ساتھ ہورہا ہے بلکہ خود امریکی کسان بھی اس استحصال کے شکار ہیں اور اب وہاں سے بھی چھوٹے کسانوں نے اس شدید گھناؤنے قانون کے خلاف آواز اٹھانی شروع کردی ہے اور امریکی عدالت عظمیٰ بھی اس موضوع کو دوبارہ سے کھولنے پر مجبور ہے۔[16]

اب اگر زمینی حقائق کا تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ہائبریڈ اور جینیاتی بیج کے بعد سے دنیا بھر کے چھوٹے کسانوں کا بیج پر سے اختیار ختم ہوتا جارہا ہے۔ زیادہ پیداوار کی لالچ میں کمپنیوں کی بیجوں کو ترجیح دے کر کسان اپنے روایتی بیج کھو بیٹھا ہے۔ اگر صرف بی ٹی کپاس کو ہی مثال کے طور پر لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جس خاص مقصد کے لیے اس بیج کو متعارف کیا گیا تھا وہ کبھی پورا نہیں ہوا۔ مونسانٹو کمپنی کا دعویٰ ہے کہ بی ٹی کپاس پر کیڑے مار ادویات کا استعمال کم ہوتا ہے مگر پاکستان اور ہندوستان میں ہونے والی مختلف تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ بی ٹی کپاس پر نا صرف کیڑے مار ادویات استعمال ہوتی ہیں بلکہ بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ہندوستان کی ایک تحقیق کے مطابق بی ٹی کپاس پر کیڑے مار ادویات کا استعمال 13 گنا بڑھ گیا ہے۔[17]

پاکستان میں بی ٹی کپاس اگانے والے چھوٹے کسانوں پر ایک تحقیق یہ واضح کرتی ہے کہ سال بہ سال اس کی پیداوار میں کمی واقع ہورہی ہے۔ جبکہ پیداواری لاگت میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا ہے۔ چھوٹے کسانوں کے مطابق ''اگر تخمینہ لگایا جائے تو بی ٹی کپاس کی زیادہ پیداواری لاگت کی وجہ سے ہمیں نقصان ہورہا ہے۔ مگر اس کے علاوہ کوئی اور دوسرا راستہ بھی نہیں کیونکہ روایتی کپاس کا حصول مشکل ہوگیا ہے''۔[18] کسان تسلیم کرتے ہیں کہ زیادہ پیداوار کی لالچ میں وہ بی ٹی کپاس کاشت کرتے ہیں مگر جب متوقع پیداوار نہیں ملتی اور اخراجات زیادہ ہوتے ہیں تو چند لمحے اسے ترک کرنے کا سوچتے ہیں مگر پھر اس لالچ میں کہ شائد اس سال فائدہ ہو پھر بی ٹی کپاس کاشت کرلیتے ہیں۔ چند کسانوں نے تو یہ بھی کہا کہ فائدہ ہو یا نقصان اب ہم بی ٹی کپاس کاشت نہیں کریں گے کیونکہ اس میں بہت خطرے ہیں۔

امریکی بین الاقوامی کمپنیاں اور جینیاتی خوراک کی امداد

دنیا کی تقریباً ایک ارب آبادی بھوک کا شکار ہے جس کے وجہ پیداوار میں کمی نہیں بلکہ وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم ہے۔ لوگوں کی خوراک کے حوالے سے خودکفالت کی حکمت عملی کو اپنانے کی بجائے بین الاقوامی کمپنیوں کو اختیار دینے کی یہ کاوشیں دراصل دنیا بھر اور خاص طور پر تیسری دنیا خصوصاً پاکستان کی دیہی آبادیوں کے لیے مزید بھوک، ابتری اور افلاس لیے ہوئے ہیں۔ رپورٹ میں دی گئی معلومات سے واضح ہے کہ امریکہ سرکار اور بین الاقوامی کمپنیاں پاکستان میں جینیاتی اجناس و اشیاء کو برآمد کرنے کے لیے قوانین کی غیر موجودگی کو قابل غور سمجھ رہی ہیں۔ ساتھ ساتھ یہ بھی نشاندہی کی گئی ہے کہ پاکستان خوراک کی امداد حاصل کرنے والوں میں سے ایک بڑا ملک ہے۔ یہ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ خوراک کی امداد مفت فراہم کی جاتی ہے۔ دراصل امدادی خوراک لینے والے ملک خوراک ایسے قرضوں کے ذریعہ خریدتے ہیں جو کہ منڈی میں موجود سود کی شرح سے کم درجہ پر مہیا کیا جاتا ہے۔ یعنی خوراک کی امداد دراصل مفت امداد نہیں بلکہ رعایتی قرضوں کی شرائط کے عوض حاصل کی جاتی ہے۔

او ڈی آئی (Overseas Development Institute/ODI) برطانیہ میں ایک غیر سرکاری ادارہ ہے جو کہ سرکاری امداد اور پالیسی سازی پر تحقیق و تبصرہ کرتا ہے۔ او ڈی آئی کے مطابق عالمی سطح پر امریکہ سب سے زیادہ خوراک کی امداد کرتا ہے۔ اجناس (in-kind) کی صورت میں دی جانے والی یہ امدادی خوراک امریکہ میں ہی کاشت ہوتی ہے۔ اس طرح کی خوراک کی امداد کو ''بندھی ہوئی'' (tied) خوراک کی امداد کہا جاتا ہے۔ او ڈی آئی کے مطابق اجناس کی صورت میں tied (ٹائیڈ) امداد کی کل امداد کا 89 فیصد حصہ امریکہ سے آتا ہے۔[19]

امریکی سرکار، خاص کر کے یو ایس ایڈ (United States Aid for International Development/USAID) کئی طریقوں سے خوراک کی امداد کو اپنی زرعی کمپنیوں کی تجارت کے فروغ، خاص کر کے جینیاتی خوراک کی امداد کو بڑھانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے۔ اس حوالے سے فریڈرک موسے (Frederic Mousseau) نے زمبیا (Zambia) میں امریکی جینیاتی مکئی کی امداد کے بارے میں تفصیلات پیش کی ہیں۔ 2002 میں کئی افریقی ممالک نے جینیاتی اجناس پر مبنی امریکہ سے آنے والی خوراک کی امداد لینے سے انکار کردیا تھا۔گوکہ کچھ افریقی ممالک نے آخر میں مجبور ہو کر یہ امداد لے لی لیکن زمبیا نے پھر بھی انکار کردیا۔ اقوام متحدہ کے ورلڈ فوڈ پروگرام (عالمی خوراک کا پروگرام) نے، جس کا منشور ہے کہ وہ اس قسم کی خوراک کی امداد آگے بڑھائے گا جس پر امداد لینے والے ممالک راضی ہوں، امریکہ کے ساتھ مل کر کافی کوشش کی کہ زمبیا جینیاتی خوراک لینے پر راضی ہوجائے۔ امریکی حکومت نے کئی ایسی رپورٹیں شائع کی جس میں زمبیا کی حکومت کو کھانے کی امداد روکنے کا ذمہ دارٹھہرانا شروع کردیا۔ یو ایس ایڈ کے کئی بیان آئے جو کہ زمبیا میں قحط کی نشاندہی کررہے تھے۔دراصل اس موقع پر زمبیا میں قحط نہیں تھا بلکہ بہت چھوٹے پیمانے پر (5 فیصد سے کم) کم غذا کی شکار آبادیاں موجود تھیں۔ اس حوالے سے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ دراصل امریکی زرعی کاروباری مفادات مثلاً یو ایس گرینز کونسل (US Grains Council) اورنیشنل کارن گروورز ایسوسی ایشن (National Corn Growers Association) کا بش انتظامیہ (Bush Administration) پر زور تھا کہ جینیاتی مکئی کو امداد کی مد میں قبول کروائیں۔ اس وقت امریکہ کی کل مکئی (corn) کی پیداوار میں 34 فیصد حصہ جینیاتی مکئی کا تھا۔[20]

امریکی خوراک کی امداد کے بارے میں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ امریکی 1985 فارم بل (Farm Bill) کے مطابق امریکی خوراک کی امداد کا 75 فیصد حصہ صرف امریکی بحری جہاز ہی لے کر جاسکتے ہیں۔[21]

امریکی خوراک کی امداد کو فروغ دینے میں کئی بڑے بڑے امریکی زرعی کاروباری ایسوسی ایشنز کا ایک کلیدی کردار ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں زیرغور ''پاکستان بائیوٹیکنالوجی انیول رپورٹ 2012'' شدید تشویش کا باعث ہے۔ پاکستان کئی سالوں سے یکے بعد دیگرے کئی طرح کی ''قدرتی'' آفات کا سامنا کررہا ہے۔ کیا خوراک کی امداد کی مد میں اس ملک میں آنے والے موسمی بحران کو استعمال کرتے ہوئے امریکی سرکار اور اس کی منافع خور کمپنیاں پاکستانی عوام کو مزید استحصال اور ظلم کا نشانہ بنائیں گی؟

سائنسی تحقیق و تدریسی ادارے اور سائنس دان

یہ نکتہ بھی زیرغور ہے کہ امریکی حکومت کپسٹی بلڈنگ (صلاحیت بڑھانے) کے لیے کئی کروڑ روپے امداد فراہم کررہی ہے۔ اس حوالے سے ایک طرف بائیوٹیکنالوجی سے منسوب سائنسدانوں اور طالب علموں کی صلاحیت بڑھانے کے لیے امداد دی جاچکی ہے۔ دوسری طرف بائیوٹیکنالوجی فصلوں کو بڑھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

امریکی امداد ناصرف خوراک کی مد میں سائنس دانوں کی جینیاتی سائنس کے حوالے سے صلاحیت بڑھارہی ہے بلکہ بائیوٹیکنالوجی ڈھانچہ کی ترقی کے لیے بھی راضی ہے۔ اس حوالے سے پاکستان کے زراعت کے مرکزی وزیر اور ان کے ساتھ وفد کو امریکی دارالخلافہ واشنگٹن ڈی سی بھی لے جایا گیا ہے۔ دومختلف گروپس یعنی بیج ٹیکنالوجی گروپ اور ڈیری جینٹکس (Dairy Genetics) گروپ کو کوکرین (Cochran) پروگرام کے تحت امریکہ بھیجا گیا۔ یو ایس ڈی اے کے مطابق کوکرین فیلو شپ پروگرام اعلیٰ اور درمیانے درجے کے نجی و سرکاری سائنس دانوں اور انتظامیہ کے اہل کاروں کے لیے امریکہ میں زراعت کے شعبے میں صلاحیت بڑھانے کا پروگرام ہے۔ یہ پروگرام ان افراد کے لیے ہے جو زرعی تجارت، زرعی کاروباری ترقی، انتظامیہ، پالیسی سازی اور مارکیٹنگ میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس تعلیمی تبادلے (educational exchange) کا مقصد دودھ کی پیداوار بڑھانے کی صلاحیت کے علاوہ امریکی جینٹکس کو ڈیری شعبہ میں فروغ دینا بھی ہے۔[22]

رپورٹ میں اس بات کی نشاندہی حیرت انگیز ہے کہ حکومت پاکستان شدید مالی بحران کے باوجود جینیاتی ٹیکنالوجی کے لیے خاطر خواہ مالی مدد فراہم کررہی ہے۔ جس ملک میں عام انسانوں کے پاس روزمرہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے وسائل نہ ہوں اور غربت، بے روزگاری، مہنگائی اپنے عروج پر ہو ایسے ملک میں سرکاری خزانہ کو عوام کی فلاح و بہبود اور ان کی خوشحالی کی اسکیموں پر استعمال کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ جینیاتی شعبوں جیسے منصوبوں کے فروغ پر جو کہ بالآخر بین الاقوامی کمپنیوں کے منافع میں بیش بہا اضافہ کا ذریعہ بنے۔

عوامی ذمہ داریاں؟

اس رپورٹ میں بارہا ذکر کیا گیا ہے کہ پاکستان انتظامیہ، صارفین اور سائنس دان جینیاتی اشیاء کے خلاف نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ این جی اوز جو کہ عام طور سے جینیاتی فصلوں کے خلاف مزاحمتی اقدام اٹھاتی ہیں ان کا خاص ذکر کیا گیا ہے۔ پاکستانی سماج اور اس میں رہنے والے دیگر طبقات اور گروہوں کا اس باریک بینی سے جائزہ واضح ثبوت ہے کہ امریکی حکومت آنے والے سالوں میں جینیاتی فصلوں کی پیداوار کے علاوہ تیار شدہ جینیاتی خوراک اور زرعی اشیاء کے لیے پاکستان میں بھرپور منڈی قائم کرنے کے ارادے رکھتی ہے اور اس حوالے سے پہلے سے سیاسی ردعمل پر مکمل توجہ دے رہی ہے۔ یو ایس ایڈ امریکی حکومت کی طرف سے مالی امداد کا محکمہ ملک بھر میں کئی غیر سرکاری تنظیموں کو مختلف ''ترقیاتی'' پروگراموں کے لیے (کئی کروڑ روپے)

امداد فراہم کررہا ہے۔ اس میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ یہ وہی گروہ/تنظیمیں ہیں جن کا کام ہے کہ عوام میں مزدور اور کسان پر مبنی پسے ہوئے طبقے کے حقوق کی بھرپور حمایت کرے لیکن اگر یہ گروہ/تنظیمیں خود ہی استحصالی کرداروں سے امداد حاصل کریں اور ان کی منڈی چمکانے کے لیے خود کو حاضر کردیں تو کیونکر ان منافع خور استحصالی قوتوں کا مقابلہ کریں گی؟

پاکستان کی کئی کسانوں کی تنظیموں اور کچھ این جی اوز نے پچھلے چند سالوں سے جینیاتی بیج اور جینیاتی پیداوار کے خلاف عملی جدوجہد شروع کررکھی ہے۔ ضرورت ہے کہ یہ تحریکیں اور تنظیمیں سامراجی پالیسیوں جو کہ سرمایہ داری کے نیو لبرل ایجنڈا کو فروغ دینے کے لیے کاربند ہیں کے خلاف بھرپور مزاحمت شروع کردیں۔ زراعت وہ شعبہ ہے جس میں اگر ایگری بزنس کو اپنے پنجے جمانے کی جگہ دے دی گئی تو عوام میں بڑے پیمانے پر بھوک ایک یقینی امر ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مختلف شعبوں کے علاوہ کسانوں کو خود کھڑے ہو کر اپنے حقوق خاص کر بیج پر اپنے اجتماعی حق کے لیے لڑنا ہوگا۔ جینیاتی بیج، جانور اور اس سے تیار کردہ غذا کا استعمال نا صرف ہماری صحت کے لے شدید مضر ہے بلکہ اس سے ماحولیات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے۔ اس کے علاوہ سب سے بڑا مسئلہ قدرت کے نظام میں ایسے غیر اخلاقی عمل کا ہے جس میں تمام جانداروں (زندگانی) کے اوپر ایک بھرپور وار کیا گیا ہے جس کے پیچھے منافع خور طبقہ کارفرما ہے۔ پاکستان کے تدریس و تحقیق کے اداروں کے لیے یہ اب بڑا امتحان ہے کہ کیا وہ اس شدید بحران کے وقت اپنے علم کو استعمال کرتے ہوئے چھوٹے کسانوں اور غریب عوام کا ساتھ دیں گے یا ملک دشمن، عوام دشمن عناصر کے ساتھ مل کر اپنے لیے آسائش اور دولت کے راستے استوار کریں گے؟ پاکستان کے ہر طبقہ کو چوکنا ہو کر جینیاتی سائنس اور اس سے جڑی منافع خور قوتوں کے خلاف مزاحمت کرنے کی شدید ضرورت ہے۔

آخر میں سب سے زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ عالمی منڈی پر قابض سرمایہ دارانہ قوتوں کی ہر نئی اور پرانی چال کا کسان اور کسان دوست گروہ ڈٹ کر مقابلہ کریں اور خوراک کے تحفظ کی بجائے خوراک کی خود مختاری کے لائحہ عمل پر کام شروع کریں۔ یقیناً یہ ایک مشکل عمل ہے مگر اس کے علاوہ شاید اب کوئی اور راستہ نہیں۔

حوالہ جات

1. GAIN Report, "Pakistan Agricultural Biotechnology Annual", 2012. USDA Foreign Agricultural Service. Global Agricultural Information Network. 7/24/2012. accessed fromgain.fas.usda.gov/Recent%20Biotechnology%20 Annual_Islamabad_Pakistan_7_24_2012.pdf on September 30,2012.

2۔ MON 531 سے مراد ہے کہ اس بی ٹی کپاس کے قسم میں جینیاتی مواد مونسانٹو کمپنی کی بنائی ہوئی بیج MON 531 کا استعمال کیا گیا ہے۔

3۔ ایک ہیکٹر 2.47 ایکٹر کے برابر ہوتا ہے۔

4۔ جینومکس وہ طریقہ کار ہے جس کے ذریعے ایک خلیہ میں موجود تمام ڈی این اے یعنی جینیاتی مواد کے بارے میں معلومات اکھٹی کی جاتی ہے۔ یعنی ایسی معلومات کہ کسی بھی جاندار میں جینیاتی مواد (ڈی این اے سیکونس) کا تجزیہ کیا جائے تا کہ اس ڈی این اے کے ڈھانچہ اور کام کے طریقے کار کو سمجھا جاسکے۔

جانوروں کی کلوننگ کے کئی طریقے ہیں لیکن مختصراً کلوننگ کا مطلب یہ ہے کہ ایک جانور کے جینیاتی مواد کو استعمال کرتے ہوئے ایک اور بالکل ویسا ہی جانور بنا دینا یا اس کی جینیاتی کاپی بنا دینا۔ یعنی دونوں جانوروں کا جینیاتی مواد بالکل ایک سا ہوتا ہے۔ اس ٹیکنالوجی سے جاندار کی پیداوار قدرتی جنسی طریقے سے نہیں بلکہ لیبارٹری میں ایک غیر جنسی اور غیر قدرتی طریقے سے ہوتی ہے۔

ایمبریو کا مطلب جینین ہے یا بیج کے اندر نباتات کی بالکل ابتدائی صورت یا پھر ایسی جاندار شئے جو اپنے وجود کے بالکل ابتدائی مراحل میں ہو۔ امبریو ٹرانسفر یا منتقلی وہ ٹیکنالوجی ہے جس میں ڈونر(donor/ ایمبریو دینے والی) مادہ ایمبریو ریسیپینٹ (recipient/لینے والی) مادہ کو دے۔ ایمبریو ٹرانسفر ٹیکنالوجی پالتو جانوروں کے سارے اقسام میں کی جاچکی ہے۔ اس کے علاوہ کئی جنگلی اور انوکھے(exotic) جانوروں میں بھی اس ٹیکنیک کا استعمال ہوا ہے۔

5۔ پہلی نسل کی سنگل جین کا مطلب ہے کہ جینیاتی انجینئرنگ صرف ایک جین کی منتقلی پر مبنی ہے جبکہ دوسری نسل سے مراد ہے جینیاتی انجینئرنگ اب مزید آگے بڑھ گئی ہے اور دو سے پانچ مختلف جینز جن کی الگ الگ خصوصیات ہیں کو منتقل کر کے نئی جینیاتی شئے بنائی گئی ہے۔ اس طرز کو اکثر اسٹیکٹ جینز کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

6۔ دراصل مونسانٹو اکثر تھرڈ پارٹی (third party) کے ذریعہ یہ معلوم کرتی ہے کہ کسی بھی علاقہ/ملک میں اسکی ذہنی ملکیت کے حقوق رکھنے والی بیج بغیر اجازت کے کتنے رقبہ پر لگائی گئی ہے۔ اسی حوالے سے اگر بالگارڈ II جینیاتی بی ٹی کپاس پاکستانی کسانوں کی زمینوں پر پائی گئی جبکہ کسانوں نے یہ بیج مونسانٹو سے ناخریدا ہوا ہو تو مونسانٹو کا مطالبہ ہے کہ 12 سے 15 ڈالر فی ایکڑ جرمانہ حکومت پاکستان کو ادا کرنا پڑے گا۔
Express Tribune, Oct 17, 2012. Bhutta, Zafar "Intellectual property rights: Punjab refuses to budge in dispute with Monsanto".

7۔ اسٹیکٹ جین سے مراد ہے کہ ایک ہی جینیاتی بیج میں دو سے پانچ مختلف خصوصیات پر حامل جینیاتی مواد کو شامل کیا جائے۔

8۔ باہر ممالک سے آنے والے انسانوں اور جانوروں کو وقتی طور پر عام آبادی سے الگ رکھنا کہ اگر کوئی بیماری اپنے ساتھ لے کر آجائیں تو اس کا پتہ چل جائے اور عام آبادی کو اس بیماری سے نقصان نا ہو۔

9. ETC Group report, "Who wil control the Green Economy?", 2012, p. 22.

10. Ibid., p. 43.

11. Ibid., p. 35.

12. www.usinfo-state.gov 11-10-2001 accessed from http://unpan1.un.org/intradoc/groups/public/documents/apcity/unpan002201.pdf

13. Delta Farm Press, Sep 2003. "Veneman: WTO prospects brighter, accessed from www.fas.usda.gov/wto/6cancun/wto_b4.htm.

14. Pollack, Andrew. "Foes of modified corn find support in a study", The New York Times, September 19, 2012, accessed from http://www.nytimes.com/2012/09/20/business/energy-environment

15. The News. "Food insecurity is the real problem of the country", November 5, 2012, p. 15.

16. Stohr, Greg. "Monsanto seed patent case gets U.S. Supreme Court review." October 5, 2012, accessed from http://www.bloomberg.com/news/2012-10-05

17. Shiva, Vandana. "Right to seed" Oct 25, 2012, The Asia Age.

18. Roots for Equity,*"Soda Zahar Ka: Pakistan main jinyati engeenring ka war BT kapas"*, 2008.

19. Harvey, Paul, et al. "Food aid and food assistance in emergency and transitional contexts: a review of current thinking". Humanitarian Policy Group, Overseas Development Institute, UK, June, 2010, p. 44.

20. Mousseau, Frederic. "Food aid or Food Sovereignty? Ending world hunger- in our time". Oakland Institute, October 2005, pp. 23-24.

21. Ibid, p.5.

22. Gorscak, Katie, Public Affairs Specialist, Foreign Agriculture Service. U.S. Bovine Genetics help increase milkproduction in Rwanda USDA Blog, June 17, 2001. Accessed from blogs.usda.gov/2011/06/17/u-s-bovine-genetics-help-increase-milk-production-in-rwanda/

مونسانٹو کا بیج پر ذہنی ملکیت کا مقدمہ.....
.....امریکی عدالت عظمیٰ کا از سر نو جائزہ*

ترجمہ: اظفر رضاء

امریکی عدالت عظمیٰ نے ایک کسان کی اپیل پر سیلف ریپلیکٹنگ (جو خود بخود اپنے آپ کو دوبارہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو) ٹیکنالوجی کو ذہنی ملکیت کے قوانین کے تحت غور کرنے کے لیے منظور کیا ہے۔ کسان کی اس اپیل کا مقصد مونسانٹو کمپنی کے جینیاتی بیجوں پر اس سیلف ریپلیکٹنگ ٹیکنالوجی کی شق سے بچنے کی راہ ہموار کرنا تھا۔

ججوں کا کہنا تھا کہ وہ وفاقی اپیل کورٹ کے فیصلے کا از سر نو جائزہ لیں گے کہ آیا (کسان) ویرون ہیو بومین (Veron Hugh Bowman) نے مونسانٹو کے ذہنی ملکیت کے حق کی خلاف ورزی کی ہے جب کہ اس نے ایک غلہ جمع کرنے والے (Grain Elevator) سے سویابین خرید کر کاشت کی تھی۔ خریدی گئی سویابین کی یہ پھلیاں دراصل ان بیجوں سے حاصل کی گئیں تھیں جو کہ مونسانٹو کی ذہنی ملکیت تھیں۔ سینٹ لوئس کے علاقے سے تعلق رکھنے والی کمپنی (مونسانٹو) کا کہنا ہے کہ اس کے ذہنی ملکیت کے حقوق سویابین کی دوسری نسل تک وسعت رکھتے ہیں۔

اس مقدمے کا مرکز وہ [سیلف ریپلیکٹنگ] ٹیکنالوجی ہے جس کے باعث باوجود اس کے کہ جینیاتی خوراک کے مخالفین اور کسانوں نے اس ٹیکنالوجی کی مخالفت کی مونسانٹو اس ٹیکنالوجی 13.5 بلین ڈالر منافع کماتے ہوئے دنیا کی سب سے بڑی بیج کمپنی بن چکی ہے۔ مونسانٹو کے راؤنڈ اپ ریڈی بیج اس طرح سے تیار کیے گئے ہیں کہ وہ جڑی بوٹی مار زہر برداشت کرسکیں۔ کسانوں نے اس کا خیر مقدم اس لیے کیا کہ اس کے استعمال سے جڑی بوٹیوں کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور فصل کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ گزشتہ برس امریکہ میں 94 فیصد سویابین ایسی جینیاتی قسم والی اگائی گئی جو جڑی بوٹی مار زہر کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی جیسے کہ راؤنڈ اپ۔

اوبامہ انتظامیہ کی عدالتی دستاویزات میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ یہ مقدمہ دوسری جدید ترین (cutting edge) ٹیکنالوجیز بشمول انسان کی بنائی ہوئی سیل لائنز (man-made cell lines)، ڈی این اے مالیکیولز (molecules)، نینو ٹیکنالوجیز (nanotechnologies) اور نامیاتی کمپیوٹروں (organic computers) کے ذہنی حق ملکیت پر بھی اثر انداز ہوگا۔

کاروبار کو خطرہ

نیو یارک کے مونس کریسپی ہارٹ اینڈ کمپنی (Monness, Crespi, Hardt & Co) کے تجزیہ کار کرس شا (Chris Shaw) کے مطابق اگر عدالت از سر نو جانچ کرتی ہے کہ آیا کمپنیاں بیجوں کو محفوظ کرنے پر پابندی لگا سکتی ہیں تو یہ مقدمہ مونسانٹو کے سویابین کاروبار کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ یہ تجزیہ کار کمپنی کے شیئرز کو فی الحال متوازن (neutral) جانچتے ہیں۔ ان کے خیال میں ''اگر کاشت کار تازہ بیج خریدنا جاری رکھیں تاکہ نئی اقسام سے فائدہ اٹھاسکیں تو مونسانٹو کے خلاف عدالتی حکم بالآخر بہت کم اقتصادی اثرات کر پائے گا''۔ مزید یہ کہ

''اس (مقدمہ) سے لوگ یقیناً خوف زدہ ہوں گے، اب دیکھنا یہ ہے کہ عدالت عظمیٰ اس معاملے کو کس طرح لیتی ہے''۔

30 ستمبر کو ختم ہونے والے گزشتہ مالی سال میں مونسانٹو نے 1.77 بلین ڈالر کی سویابین اور جینیاتی اجازت نامے (genetic licenses) فروخت کیے جو کہ کمپنی کا تقریباً 13 فیصد ہیں۔ سویابین یونٹ میں مجموعی منافع 1.16 بلین ڈالر تھا جو مونسانٹو کے کل منافع کے 16 فیصد سے زیادہ ہے۔

قانونی معاملہ دراصل اس بات سے نکل رہا ہے کہ مونسانٹو کمپنی زور دیتی ہے کہ کسان ہر سال جینیاتی بیجیں خریدیں، بجائے اس کے کہ وہ گزشتہ حاصل کردہ پیداوار سے کچھ بیج بچا کر اسے بو دیں۔ وہ کسان جو کسی باقاعدہ بیوپاری (authorized dealer) سے بیج خریدتے ہیں، وہ ضرور پابند ہوں گے کہ وہ کسی بھی طور پچھلی پیداوار کو اگلی کاشت کے لیے استعمال نہ کریں۔

غلہ رکھنے والا (Grain Elevator)

1999 سے 2007 تک بومین (Bowman) نسبتاً کم مہنگے سویابین کے بیج خرید کر اپنی ضرورت پوری کرتا رہا جو اسے ایک غلا رکھنے والے (Grain Elevetor) سے دستیاب ہوجاتے تھے کیونکہ غلہ رکھنے والا ان کسانوں سے فصل خرید لیتا تھا جو مونسانٹو کے بیج استعمال کرتے تھے۔ یہ دوسری نسل (second generation) کی پھلیاں اپنے اندر جڑی بوٹی مار زہر برداشت کرنے کی صلاحیت برقرار رکھتی تھیں۔ جب مونسانٹو کو اس طریقے کار کے بارے میں پتہ چلا تو کمپنی نے بومین پر مقدمہ دائر کردیا۔

امریکہ میں وفاقی اپیل کورٹ (US Court of Appeals for the Federal Circuit) جو ذہنی ملکیت کے حقوق کے مقدمے نمٹاتی ہے نے مونسانٹو کی حمایت کی تھی۔ پینل نے بومین کے اس خیال کو مسترد کر دیا تھا کہ جب اس نے بیج خریدے تو اس وقت مونسانٹو کا ان بیجوں پر حق ملکیت ''ختم'' ہو چکا تھا۔ اپیل کورٹ نے کہا کہ بیج سے اگلی نسل کے سویابین اگا کر بومین نے ''قانون کی خلاف ورزی کی مد میں ایک نئے دفعہ کی جگہ بنادی ہے''۔ ایک بیان میں مونسانٹو نے کہا کہ وفاقی عدالت کے فیصلے سے ''پوری زرعی بائیوٹیکنالوجی صنعت (agriculture biotechnology industry) کے لیے ذہنی ملکیت کے حقوق کی اہمیت ایک بار پھر سے مستحکم ہوئی ہے''۔

ہر کسان

بومین کے وکلاء نے اپنی اپیل میں کہا کہ یہ معاملہ ''بومین کی طرح ملک کے ہر کسان اور اس کے طریقہء کاشت پر اثرات مرتب کرے گا جو نسلوں سے ایسا کرتے آرہے ہیں''۔ وکلاء نے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ ذیلی عدالت نے اپنے فیصلے میں ذہنی ملکیت کی معیاد کا خاتمہ کر کے قانون شکنی کرنے والوں کے لیے جینیاتی بیجوں میں سیلف ریپلیکیٹنگ ٹیکنالوجیز کے حوالے سے دفاع کے تمام راستے مکمل طور پر بند کر دیے ہیں۔

عدالت عظمیٰ نے اوبامہ انتظامیہ کی ہدایت کے برخلاف اس مقدمے کو دوبارہ سے اٹھایا جن کے مطابق فیڈرل سرکٹ مقدمے کے صحیح نتیجے تک جا پہنچی تھی۔ یہ مقدمہ فیڈرل سرکٹ کے اپنائے گئے قانون جس میں ذہنی ملکیت کے حقوق کو بڑھایا گیا تھا کو نیچا دیکھا سکتا ہے۔ اس نام نہاد مشروط فروخت سے استثنیٰ کے تحت ذہنی ملکیت کا حق رکھنے والا اپنی مصنوعات کے حقوق کو فروخت کے بعد بھی یقینی بنا سکتا ہے۔ اس قانون کے ذریعے ذہنی ملکیت کا حق رکھنے والے کے پاس یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنی ٹیکنالوجیز کو بیچنے کے بعد دوسرے خریداروں پر پابندیاں لگا سکے۔

عدالت عظمیٰ نے 2008 میں اسی قانون پر سوال اٹھائے تھے۔ اس وقت ججوں نے مشترکہ طور پر یہ کہا تھا کہ ایل جی الیکٹرونکس انٹرنیشنل اپنے میموری تکنیکی حقوق (Memory-technology patents) انٹل کارپوریشن (Intel Corp) پر یا ان کمپیوٹر بنانے والوں پر عائد نہیں کرسکتی جو انٹل چپ اپنی مشین میں استعمال کرتے ہیں۔

غیر مستقل اصول

اوبامہ انتظامیہ کے عدالت عظمیٰ کے صف اول کے وکیل اور اعلیٰ قانونی مشیر ڈونلڈ ویریلی (Donald Verrilli) نے ججوں کو بتایا کہ (مونسانٹو کا موجودہ کیس) مشروط فروخت کے اصول 2008 کے فیصلے کے مطابق نہیں ہے (یعنی 2008 میں محتسب نے فیصلہ انٹل کارپوریشن کے حق میں دے کر ذہنی ملکیت کے مالک ایل جی الیکٹرونکس انٹرنیشنل کے خلاف دیا تھا)۔ بہرکیف ویریلی نے کہا کہ مونسانٹو مقدمے میں عدالت کو اپیل مسترد کر دینی چاہیے کیونکہ وفاقی عدالت نے مشروط فروخت کے معاملے پر توجہ ہی نہیں دی تھی۔

واشنگٹن اسٹیٹ یونیورسٹی میں سینٹر برائے پائیدار زراعت اور قدرتی وسائل میں کاروبار، اوریگون (Center for Sustaining Agriculture and Natural Resources in Enterprise, Oregon)، کے محقق پروفیسر چک بن بروک (Chuck Benbrook) نے کہا کہ سپریم کورٹ نے اگر بیج بچانے کی پابندی کو مسترد کر دیا تو انہیں حیرانگی ہوگی۔ ''اگر اسے مسترد کیا گیا تو بیج بائیوٹیک کی صنعت پر کاروباری حوالے سے بڑے بھیانک اثرات مرتب ہوں گے''۔ بن بروک نے مزید کہا کہ ''یہ قانون زرعی بائیوٹیک صنعت کو اور یقینی طور پر سویا بین کو جس شکل میں ہم جانتے ہیں ختم کرسکتی ہے''۔

عدالت دلائل سنے گی اور جون تک فیصلہ دے گی۔ یہ مقدمہ بومین بمقابلہ مونسانٹو 11-796 (Bowman v. Monsanto, 11-796) کہلاتا ہے۔

- اس خبر کو لکھنے والے رپورٹر گریگ اسٹوہر (Greg Stohr) سے واشنگٹن (Washington) میں اس ای میل پر رابطہ کیا جاسکتا ہے: gstohr@bloomberg.net.
- خبر کے ایڈیٹر اسٹیون کومارو (Steven Komarow) سے رابطہ اس ای میل پر کیا جاسکتا ہے: skomarow1@bloomberg.net.

* Stohr, Greg. "Monsanto seed patent case gets U.S. Supreme Court review." October 5, 2012, accessed from http://www.bloomberg.com/news/2012-10-05

جینیاتی فصلوں پر فلپائن سے ایک تحقیقی رپورٹ*

ترجمہ: سعید احمد

قارئین کے لیے گزشتہ شمارے (اپریل تا جون2011) میں فلپائن میں جینیاتی فصلوں پر ہونے والی ایک تحقیق کا خلاصہ پیش کیا گیا تھا۔ اس شمارے میں ہم اسی تحقیق کے دیگر حصوں کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔

فلپائن کے کسان سائنسدانوں کے گروپ ماسی پاگ (Masipag) اور ای بون (IBON) فاؤنڈیشن جو کہ ایک عوامی تحقیقی ادارہ ہے نے جینیاتی فصلوں کے حوالے سے ایک مشترکہ تحقیق کی۔ تحقیق سے یہ بات سامنے آئی کہ اس دعویٰ کے برخلاف کہ جینیاتی فصلوں پر کیڑے مار ادویات کا استعمال انتہائی کم یا بالکل نہیں ہوتا، جینیاتی فصلوں پر پہلے سے زیادہ کیڑے مار ادویات کا استعمال ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تحقیق سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ صنعتی طریقہ زراعت کے نتیجے میں زمین کی زرخیزی کم ہونے کے علاوہ خوراک کی غذائیت میں بھی کمی واقع ہوئی ہے۔ تحقیق کے مطابق گو کہ جینیاتی مکئی پہلے سال اچھی پیداوار دیتی ہے مگر بعد میں کیمیائی کھاد اور کیڑے مار ادویات کے زیادہ استعمال کے نتیجے میں پیداواری لاگت بہت بڑھ جاتی ہے اور کسان قرضوں کے بوجھ تلے دبتے چلے جاتے ہیں۔

جی ایم مکئی کے آنے سے مکئی کی کاشت کے ابتدائی اخراجات میں نمایاں اضافہ

2003-2011 تک کے ابتدائی اخراجات کے مطابق کاشتکاروں کے زیر استعمال کھاد کی قسم 14-14-14 اور یوریا کی قیمتیں بالترتیب 13.7 فیصد اور 10.6 فیصد بڑھ چکی ہیں۔ سب سے زیادہ قیمتیں 2008 میں بڑھیں کیونکہ اس سال 14-14-14 کھاد فی بوری Php 1671.67 (پیسو) اور یوریا 1551.43 پیسو فی بوری ہو گئیں۔ 2000 کی دہائی کے آغاز میں جینیاتی (جی ایم) مکئی کی افتتاحی قیمت تقریباً وہی تھی جو روایتی مکئی کی تھی۔

کاشتکاروں کا کہنا ہے کہ پہلے جی ایم مکئی کے بیج 18 تا 20 کلو فی بوری کے حساب سے فروخت کیے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر فلپائن کے علاقے کوارٹیرو، کیپیز (Cuartero, Capiz) میں راؤنڈ اپ ریڈی (RR) جی ایم مکئی جب شروع میں متعارف کرائی گئی تو اس کی قیمت 2,800 پیسو فی 18 کلو بوری تھی جو ایک ہیکٹر (2.47 ایکڑ) زمین کے لیے کافی ہے۔ 2008 میں نو کلو بوری کی قیمت 4,600 پیسو ہو گئی۔ یوں مکئی کاشت کرنے والے کاشتکاروں کو صرف RR (آر آر) مکئی کی دو بوریوں کے لیے اب 9,200 پیسو خرچہ کرنا پڑتے ہیں۔

یوں کل ملا کر 18 کلو جی ایم مکئی اور راؤنڈ اپ ریڈی ہربیسائیڈ پر کاشتکاروں کو 10,700 پیسو خرچ کرنے پڑے جو کہ اس مکئی کی افتتاحی قیمت سے 7,900 پیسو اضافی ہے یا یوں کہہ لیں کہ 282 فیصد زیادہ ہے۔ ڈاکٹر مدینہ کے بقول "کہا جاتا ہے کہ جی ایم مکئی جیسی ہربیسائیڈ کو برداشت کرنے والی اقسام سے کسان کی پیداواری لاگت میں کمی ہو سکتی ہے لیکن اس کے برخلاف کسان اس ٹیکنالوجی کو استعمال کرنے کے نتیجہ میں زیادہ خرچ کر رہے ہیں"۔

کسان قیمت ادا کرتے ہیں

وہ کسان جو خرچ برداشت نہیں کر سکتے ہیں وہ بالعموم زمین پر سے ہی اختیار کھو بیٹھتے ہیں۔ یعنی کون سی فصل اگائیں؟ کون سی فصل کی کون سی قسم لگائیں؟ تاجر حضرات صرف اسی صورت میں قرضہ دے رہے ہیں کہ جب کسان جی ایم مکئی لگائیں جبکہ کاشتکار دوسری قسم کی مکئی لگانا چاہتے ہیں۔ بعض صورتوں میں کسان قانونی کاروائی مثلاً قرض ادا نہ کرنے پر گرفتاری سے بچنے کے لیے زمینوں کو چھوڑ دیتے ہیں یا پھر ٹھیکہ پر دے دیتے ہیں یا پھر چلے جاتے ہیں۔

کارڈن (Cordon) میں ایک ماں ایسا بیل (Isabel) نے بتایا کہ اس کے خاندان نے راتیں جاگ جاگ کر گزاریں تاکہ بہت بڑے قرض کی ادائیگی کے لیے مکئی کی فصل کی کٹائی سے حاصل ہونے والی آمدنی میں سے کچھ بچایا جا سکے۔ اس نے اپنی زبان میں کہا کہ "ہم خراب اور اچھی مکئی کی چھانٹی کے دوران محض روتے ہیں اور یہ سوچتے رہتے ہیں کہ ہم قرضوں کی ادائیگی کیونکر کر پائیں گے"۔

10 سال بعد، کوئی بعد از تجارت نگرانی نہیں

جینیاتی پیداوار کے بکنے کے بعد کی نگرانی نہیں کی جا رہی۔ BPI (بی پی آئی) کے مطابق 6,55,589 ہیکٹر پر جو مکئی ملک میں پیدا کی گئی اس میں زیادہ تر وہ مکئی کی قسم تھی جو ایک ہی بیج میں مختلف جینیاتی مواد رکھتی ہو۔ یعنی اسٹیکٹ ٹریٹ (stacked trait) قسم ایسی قسم کے جینیاتی مواد میں بی ٹی کی خصوصیات کے علاوہ ہربیسائیڈ برداشت کرنے والی جینیاتی خصوصیات بھی شامل ہے۔ "اگر آپ حساب لگائیں تو آر آر مکئی کو ایک ہیکٹر کی کاشت پر چار لیٹر گلائی فوسیٹ (glyphosate) یا آر آر ہربیسائیڈ کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر ملک میں 6,55,589 ہیکٹر پر مکئی موجود ہے تو اس پر 2,622,356 لیٹر ہربیسائیڈ کا چھڑکاؤ کیا جاتا ہے اور یہ صرف ایک موسم کے لیے ہے۔ کیونکہ ہم عموماً ایک سال میں دو دفعہ مکئی کی فصل کاشت کرتے ہیں۔ پس آہستہ آہستہ ہم اپنی زرعی زمینوں کو بھی تباہ کر رہے ہیں اور بالآخر غذائی نظام کو بھی ختم

کررہے ہیں''۔ یہ ڈاکٹر مدینہ کے الفاظ تھے۔

گائلزاریک سیرالینی (Gilles-Eric Seralini) کی تحقیق کے مطابق آرآر کے استعمال کی وجہ سے حمل ابتدائی مراحل میں ہی ضائع ہوسکتا ہے۔ مزید برآں، آرآر کے دیگر اجزاء متحرک ہوکر گلائی فوسیٹ کے عمل کو تیز تر کر دیتے ہیں جس کے نتیجہ میں مزید ایسے اجزاء (metabolites) وجود میں آسکتے ہیں جو کہ اور زیادہ زہریلے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر مدینہ کہتے ہیں کہ ''غور کیجیے کہ کسان 2006 سے آرآر چھڑک رہے ہیں اور اس ہربیسائیڈ کی باقیات جینیاتی مکئی کی غذا اور چارے کی اقسام کو آلودہ کررہی ہیں''۔

ہربیسائیڈ کے استعمال کے نتیجے میں تلف ہونے والے غیر ضروری خود رو پودے جو کہ زمین کو مضبوط رکھتے تھے کے خاتمے کی وجہ سے زمین کا کٹاؤ ہورہا ہے۔ ان ادویات کے ماحول میں پھیلنے سے سبزیاں اور پھل دار درخت بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اس طرح کسانوں کی غذا کا تحفظ بھی نمایاں طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ زمین کی تباہی کی وجہ سے اس کی غذائی اجزاء میں کمی واقع ہوتی ہے اور پھر کسانوں کو زیادہ کھاد استعمال کرنی پڑتی ہے۔ ہربیسائیڈ ادویات کے مسلسل استعمال سے غیر ضروری خود رو پودوں میں مزاحمت پیدا ہوگئی ہے۔

نئے نئے کیڑے پیدا ہورہے ہیں۔ مکئی کے پودے کی ٹڈیاں جی ایم مکئی کے کھیتوں پر اثر انداز ہورہی ہیں اور اس سے ہونے والے نقصان کے نتیجے میں کسان دیوالیہ ہورہے ہیں۔ جیسا کہ سین ڈی اون ایسیو، ایلوئی لو (San Dionisio, Iloilo) میں کی گئی تحقیق سے واضح ہوا۔ وہ بھٹوں پر حملہ کرتی ہے، دانوں کو بڑھنے سے روکتی ہے۔ یوں بیج کے اندرون نرم موادنہیں بننے پاتا۔

نارتھ کوٹا باٹو (North Cotabato) کے شہر الامادا (Alamada) میں 2011 کے شروع میں مکئی کے پتوں میں پھپھوند کی بیماری کی وجہ سے تقریباً 12,000 ہیکٹر جینیاتی مکئی کے کھیت (جو تقریباً 60,000 میٹرک ٹن مکئی پیدا کرتا) ختم ہوگئے۔ زیلڈی بالورون (Zaldy Boloron)، جو محکمہ زراعت کے ریجن 12، ریجنل فارم یونٹ (RFU) کے افسر تھے، کے مطابق اس بیماری کا سبب کسانوں کا غیر ضروری خود رو پودوں کو تلف کرنے کے لیے زمین کی گوڈی کے بجائے گلائی فوسیٹ ہربیسائیڈ کا استعمال ہے۔ اگر زمین میں ہل نہ چلایا جائے تو پتے میں پھپھوند والی بیماری بڑے پیمانے پر پھیلتی ہے۔ مکئی کے کاشتکاروں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ زمین میں گہرا ہل چلانے کی روایت کو واپس لائیں۔ پتے میں پھپھوند کی بیماری سے بچاؤ کا صرف ایک حل ہے کہ زمین میں گہرا ہل چلایا جائے۔ کاشتکاری کا سب سے اچھا طریقہ گہرا ہل ہے۔

یہ بھی بتایا گیا کہ غریب کسان اور مقامی لوگ کبھی کبھی جینیاتی مکئی خوراک تک رسائی کی کمی کی وجہ سے کھالیتے ہیں۔ ان میں تقریباً تمام لوگ پیٹ کے درد، گیس کے درد، دست، سانس رکنے، سینے کا درد، کھانسی، خارش اور جلدی بیماری جیسی امراض میں مبتلا پائے گئے ہیں۔ کسانوں نے جینیاتی مکئی کے بالکل نئے اگے ہوئے دانے (young) کھانے کے بعد ہونٹوں اور زبان کے بے حس ہونے کی بھی شکایت کی۔ یہ بھی مشاہدہ کیا گیا کہ جب مکئی کے پودوں میں پھول آنے لگتے ہیں تو بچوں میں دمے کے حملے کے واقعات بڑھ جاتے ہیں۔ مکئی کے پھول جب نکلے ہوئے ہوں اور بچے کھیتوں سے گزریں تو وہ کھانسنے لگتے ہیں۔ کسان ہربیسائیڈ کا چھڑکاؤ کرنے کے دوران سردرد، سانس رکنا اور جلدی خارش جیسے امراض میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

بی ٹی بیگن کی تجارت کا خوف

ڈاکٹر مدینہ کہتے ہیں کہ ''اب یہ صورت ہے کہ مکئی کی صنعت کھربوں کی صنعت ہے جس میں تاجر، سرمایہ کار، زمیندار، بڑے بڑے غیر ملکی کاروباری (compradors) اور بین الاقوامی کمپنیاں مثلاً مونسانٹو، پائنیر اور سنجنٹا خوب خوب فائدہ اٹھارہے ہیں۔ وہ عرصہ دراز سے کمپنیوں کے مفاد اور کسان کے دشمن نظام سے بی پی آئی جیسی سرکاری ایجنسیوں اور نیم سرکاری سائنسدانوں کے ڈھیلے ڈھالے قوانین سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بے تحاشہ منافع کما رہے ہیں۔ جینیاتی مکئی کے بارے میں جو دعویٰ کیا گیا تھا کہ اس سے پیداوار بڑھے گی اور چھوٹے کسانوں کی آمدنی میں اضافہ ہوگا، دس سال کے بعد یہ وعدے غلط ثابت ہوگئے''۔

ڈاکٹر مدینہ مزید کہتے ہیں کہ ''ہمیں اندیشہ ہے کہ جینیاتی بیگن سے کسانوں کا بھی وہی حشر ہوگا جو جینیاتی مکئی کے کاشتکاروں کا ہوا۔ ہمیں امید ہے کہ حکومت اور خاص طور پر عدالت عظمیٰ جینیاتی بیگن کے پیش کاروں کی ''میٹھی میٹھی باتوں'' میں نہیں آئے گی۔ جینیاتی مکئی کے تجربے نے ہمیں سب کچھ بتادیا ہے۔ ہم عدالت عظمیٰ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ عارضی ماحولیاتی تحفظ کے حکم (TEPO) پر عمل درآمد کرائے اور مسلسل تحقیقات کرائیں کہ جی ایم اوز سے اصل میں کون کون فائدہ اٹھا رہا ہے۔ جی ایم اوز کے قوانین اور نگرانی کے عمل کے ساتھ ساتھ جینیاتی مکئی میں قرض دینے کے طریقوں کی بھی تحقیقات کرانی چاہیے۔ کاشت کرنے کے طریقوں کی بھی تحقیقات ہونی چاہیے۔ جب تک اس احتساب کے نتائج سامنے نہ آجائیں تمام جینیاتی درآمدات، کھیتوں پر تجربے اور کمرشیلائزیشن (کاروباری عوامل) روک دی جائے''۔

ڈاکٹر مدینہ نے کہا کہ حکومت کو چاہیے کہ تحفظ خوراک کے حصول کے لیے اپنی توجہ پائیدار ذرائع مثلاً مختلف انواع و پائیدار زراعت پر دے اور سرمایہ دارانہ طریقہ زراعت کو ختم کردے۔ کیمیائی، سرمایہ دارانہ اور جینیاتی طریقوں پر مبنی زراعت ماضی کا حصہ ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ چھوٹے پیمانے پر ہونے والی کاشتکاری، جو حیاتیاتی تنوع اور مربوط زرعی نظام کے ذریعے تحفظ خوراک اور خوراک کی خودمختاری پر مبنی ہو کو فروغ دے۔

* Gerry Albert. "Agri NGO rejects BT egg plant". June 10, 2012, accessed from http://www.allvoices.com/contributed-news/12353977-agri-ngo-rejects-bt-talong

بات تو سچ ہے مگر... زرعی خبروں کا مختصر جائزہ (جولائی تا دسمبر، 2012)

الف۔ ملکی زرعی خبریں

ا۔ زرعی مواد

زمین

30 جون: سندھ ہاری پورھیت کے پنہل ساریو نے حیدرآباد میں ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے حقیقی زمینی اصلاحات کا مطالبہ کرتے ہوئے ذوالفقار آباد کے منصوبے اور کارپوریٹ فارمنگ آرڈیننس کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا جس کے ذریعے لاکھوں ایکڑ زرعی زمین غیر ملکیوں کو دی جارہی ہے (ڈان 1 جولائی، صفحہ20)۔

6 اگست: ایک خبر کے مطابق کوہستان کے تقریباً 500 خاندان بٹ گرام کے قریب چھتر کے میدانی علاقے پر تین دہائیوں سے زمین پر مزدوری کرتے چلے آرہے ہیں۔ ایک کرکٹ کھیل میں کوہستانی اور سواتی لڑکوں کی لڑائی میں گولیوں کے تبادلے کے بعد کوہستانی لڑکا زخموں کی تاب نہ لاسکا۔ اس کے بعد تینوں قبائل کے بڑوں نے جرگے میں کوہستانیوں کو مختلف جرائم کا ذمہ دار قرار دے کر 60 دنوں میں علاقے خالی کرنے کا کہا ہے (ایکسپریس ٹریبیون، 7 اگست، صفحہ2)۔

27 اگست: حیدرآباد میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کسانوں کی تنظیموں نے حکومت سے زمینی اصلاحات کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ زمیندار اور مڈل مین ان کی محنت کی آمدنی کا 70-60 فیصد منافع لے جاتے ہیں (ڈان، 28 اگست، صفحہ28)۔

6 ستمبر: ملتان میں دو روزہ کسان کنونشن جسے ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان نے منعقد کیا میں زمینی اصلاحات کا مطالبہ کیا گیا (ڈان، 7 ستمبر، صفحہ2)۔

7 ستمبر: سوپارکو اور انسٹی ٹیوٹ آف اسپیس ٹیکنالوجیز (Institute of Space Technologies) نے اسلام آباد میں ایک کانفرنس کے دوران حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ زمین پر فصلیں اگانے کے بجائے تجارتی مقصد کے لیے ہائیڈرو فونک سسٹم (hydrophonic system) (فضاء میں فصلیں اگانے) کو اپنائے جیسا کہ بہت سے ملکوں میں کیا جاتا ہے (ڈان، 6 ستمبر، صفحہ10)۔

15 ستمبر: ایک قومی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے، ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے ڈائریکٹر، آئی اے رحمان نے کہا کہ ملک میں بنیادی حقوق کے نفاذ میں جاگیرداری سب سے بڑی رکاوٹ ہے (ڈان، 16 ستمبر، صفحہ4)۔

19 دسمبر: قومی اسمبلی کی پبلک اکاؤنٹ کمیٹی (Public Account Committee) نے محکمہ دفاع کو ہدایت کی کہ وہ اعلیٰ فوجی افسران کو زرعی زمین الاٹ کرنے کی پالیسی فوراً ختم کرے (ڈان، 20 دسمبر، صفحہ1)۔

20 دسمبر: سندھ ہائی کورٹ نے صوبائی چیف لاء آفیسر کو حکم جاری کیا ہے کہ وہ حکومت کی لینڈ گرانٹ پالیسی ریکارڈ کورٹ میں پیش کرے جس کے ذریعے زرعی زمین کو رہائشی، کاروباری اور صنعتی علاقوں میں تبدیل کیا جارہا ہے (ڈان، 21 دسمبر، صفحہ15)۔

29 ستمبر: زرعی سینسس سروے 2010 کے اعداد وشمار کو مرکزی ادارہ برائے اعداد وشمار (Federal Bureau of Statistics) نے جاری کردیا (ڈان، 30 ستمبر، صفحہ11)۔

جبری مشقت:

2 جولائی: سندھ میں زمینی اصلاحات کی تحریک (Sindh Land Reform Movement /SLRM) جس میں 18 ادارے شامل ہیں، نے جبری مشقت کے شکار مزدوروں کے حقوق کے تحفظ کے لیے عملی اقدامات کا اعلان کیا (دی نیوز، 3 جولائی، صفحہ19)۔

9 جولائی: سندھ ہائی کورٹ حیدرآباد سرکٹ بینچ نے 26 ہاریوں کو ایک زمیندار کے قبضے سے آزاد کرایا۔ یہ ہاری بدین کے ایک گاؤں میں قرض کی وجہ سے زمیندار کے پاس جبری مشقت کررہے تھے (دی نیوز، 10 جولائی، صفحہ5)۔

20 ستمبر: عمرکوٹ میں سیشن کورٹ نے 24 جبری مزدور، جن میں پانچ عورتیں اور 14 بچے شامل ہیں کو ایک زمیندار کے قبضے سے آزاد کرادیا (ڈان، 27 ستمبر، صفحہ18)۔

16 دسمبر: سندھ ہائی کورٹ سرکٹ بینچ حیدرآباد، کے حکم پر کنری پولیس نے ایک زمیندار کی زمین سے 26 جبری مزدوروں کو رہا کروایا، اس میں آٹھ عورتیں اور 12 بچے شامل ہیں (ڈان، 17 دسمبر، صفحہ16)۔

پانی

9 جولائی: پلاننگ کمیشن نے آبپاشی کے لیے نہری پانی کی قیمت پر اپنی رپورٹ میں ملک بھر میں آبیانہ بڑھانے کی تجویز پیش کی تاکہ نہری پانی کے نظام کو برقرار رکھنے کی قیمت وصول ہوسکے (ڈان، 10 جولائی، صفحہ9)۔

11 جولائی: ایگری فارم پاکستان، متحدہ کسان محاذ اور کسان بورڈ نے آبیانہ ٹیکس

بڑھانے کی مخالفت کرتے ہوئے حکومت سے کہا کہ آبیانے کی رقم بینک میں جمع کروانی چاہیے۔ کاشتکار پٹواری نظام کی وجہ سے 300 گنا زیادہ رقم حکومت کو ادا کررہے ہیں۔ ایگری فارم کے ابراہیم مغل نے کہا کہ ہندوستان کی حکومت نے آبیانہ ٹیکس ختم کردیا ہے کیونکہ محصولات کے عملے کا پیسہ جمع کرنے کا خرچہ اس سے زیادہ ہوتا تھا (ایکسپریس ٹریبیون، 12 جولائی، صفحہ 5)۔

7 ستمبر: پنجاب میں زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے بہتر آبپاشی کے بڑے منصوبے (Punjab Irrigated-Agriculture Productivity Improvement Project / PIPIP) کے تحت ڈرپ (drip) اور اسپرینکلر (sprinkler) آبپاشی کے سسٹم کو پنڈی اور سرگودھا کے علاقوں میں 3,000 ایکڑ پر نصب کیا جائے گا (دی نیوز، 8 ستمبر، صفحہ 18)۔

12 ستمبر: ایک خبر کے مطابق عالمی بینک نے پاکستان میں پانی کے اہم منصوبوں کے لیے بیرون ملک مقیم پاکستانیوں سے فنڈز حاصل کرنے کے لیے پانی کے بانڈز کے اجراء کا کام شروع کردیا ہے (دی نیوز، 13 ستمبر، صفحہ 3)۔

20 ستمبر: یو ایس ڈی اے (United States Department of Agriculture/USDA) یعنی امریکی محکمہ برائے زراعت کے کونسلر نے اسلام آباد میں ایک میٹنگ میں کہا کہ چونکہ پاکستان میں 90 فیصد پانی زراعت کے لیے استعمال ہوتا ہے اس لیے یہ اس شعبے کی ذمہ داری ہے کہ وہ پانی کی سپلائی کا تحفظ کرے اور اس کے استعمال کے طریقوں کو بہتر بنائے (ایکسپریس ٹریبیون، 21 ستمبر، صفحہ 11)۔

10 دسمبر: کراچی میں ہیومن رائٹس گروپ کی جانب سے پانی کے موضوع پر سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے سندھ کے وزیر شرجیل میمن نے کہا کہ سندھ کی حکومت نے 2012-13 کے سالانہ بجٹ میں صاف پانی فراہم کرنے کے لیے 8.5 بلین روپے رکھے ہیں۔ پہلے مرحلے میں صوبے کے نو اضلاع میں 285 واٹر فلٹریشن پلانٹس قائم کیے جائیں گے (دی نیوز، 11 دسمبر، صفحہ 22)۔

پانی کی قلت:

8 جولائی: سندھ آبادگار بورڈ نے مطالبہ کیا کہ حکومت کو کوٹری بیراج سے نکلنے والی نہروں کا علاقہ آفت زدہ قرار دے دینا چاہیے کیونکہ وہاں خریف کے موسم میں پانی کی 80 فیصد تک کمی ہے جبکہ یہ کمی گدو اور سکھر بیراج کے علاقوں میں صرف 26 اور 36 فیصد ہے (ڈان، 9 جولائی، صفحہ 16)۔

9 جولائی: نیشنل پارٹی کے سربراہ حاصل خان بزنجو نے کراچی میں اخباری نمائندوں کو بتایا کہ گوادر شہر میں لوگ پانی کے ایک ٹینکر کے 15,000 سے 17,000 روپے ادا کررہے ہیں۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ حکومت سمندر کے پانی کو صاف کرنے کا پلانٹ ہنگامی بنیادوں میں شہر کے لیے فراہم کرے (دی نیوز، 10 جولائی، صفحہ 19)۔

17 اگست: موسمی تبدیلی (کلائمٹ چینج) کے محکمے کے اعلیٰ افسروں کی ہنگامی میٹنگ میں ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ پاکستان کے پانچ بڑے ڈیموں میں پانی کی سطح اس وقت تشویش ناک حد تک کم ہے (دی نیوز، 19 اگست، صفحہ 12)۔

11 ستمبر: سندھ کسان رہنما سہتو کے مطالبات کا سوموٹو نوٹس لیتے ہوئے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے تین دن کے اندر سندھ کے محکمہ آبپاشی سے پانی کی چوری کا ریکارڈ طلب کرلیا جس سے نہر کے آخری سرے کے غریب کسان مشکلات کا شکار ہیں (دی نیوز، 12 ستمبر، صفحہ 1)۔

14 ستمبر: بارشوں کے باوجود انڈس ریور سسٹم اتھارٹی (IRSA) کے مطابق ربیع کی فصل میں پانی کی قلت تقریباً 19 فیصد رہے گی (ڈان، 15 ستمبر، صفحہ 9)۔

22 ستمبر: واپڈا کے مطابق پاکستان میں فی کس پانی کی دستیابی ہر روز کم ہورہی ہے جس سے ملک کا غذائی تحفظ خطرے میں آ گیا ہے۔ 1951 سے 2010 تک پانی کی دستیابی 406 فیصد کم ہوئی ہے یعنی اس عرصے میں 5,260 سے کم ہو کر 1,036 کیوسک میٹر رہ گئی ہے (دی نیوز، 23 ستمبر، صفحہ 15)۔

بھاشا ڈیم:

3 ستمبر: ایشین ڈیولپمنٹ بینک کے قومی ڈائریکٹر نے اسلام آباد میں کہا کہ ان کا بینک 12 بلین ڈالر کی لاگت کے بھاشا ڈیم سے الگ نہیں ہوا ہے۔ اخباروں میں اس حوالے سے خبریں پیچیدگی کو نہیں دیکھ رہی ہیں۔ بینک تنہا اتنے بڑے پروجیکٹ کے لیے سرمایہ فراہم نہیں کرسکتا لیکن چین سے کوئی معاہدہ کرنے سے پہلے پاکستان کو بین الاقوامی ٹینڈر حاصل کرنے کے عمل سے گزرنا چاہیے (ڈان، 4 ستمبر، صفحہ 3)۔

6 دسمبر: وزیر خزانہ حفیظ شیخ نے امریکہ سے واپسی پر کہا کہ امریکہ نے دیامیر بھاشا پروجیکٹ کے لیے 200 ملین ڈالر فراہم کرنے کی رضا مندی ظاہر کی ہے (ڈان، 7 دسمبر، صفحہ 16)۔

کالا باغ ڈیم:

1 دسمبر: وزیر اعظم راجہ پرویز اشرف نے کالا باغ ڈیم پر لاہور ہائی کورٹ کے حالیہ فیصلے پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ ایسے ملکی منصوبوں پر اتفاق رائے کے بعد ہی عمل کیا جاسکتا ہے (ڈان، 2 دسمبر، صفحہ 1)۔

1 دسمبر: خیبر پختون خواہ کی حکومت نے لاہور ہائی کورٹ کے کالا باغ ڈیم کے فیصلے پر سپریم کورٹ سے سوموٹو نوٹس لینے کی درخواست کی ہے (ڈان، 2 دسمبر، صفحہ 12)۔

6 دسمبر: سندھ اسمبلی کے ارکان نے کالا باغ ڈیم کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ یہ ڈیم کبھی نہیں بننے دیا جائے گا (ڈان، 7 دسمبر، صفحہ 15)۔

11 دسمبر: لاہور میں ایک مشترکہ پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کسانوں کی آٹھ تنظیموں نے کہا کہ کالا باغ ڈیم ایک سیاسی منصوبہ نہیں ہے بلکہ معاشی فیصلہ سازی کا سوال ہے۔ انہوں نے لاہور ہائی کورٹ کے حالیہ فیصلے کا خیرمقدم کرتے ہوئے کہا کہ وہ امید رکھتے ہیں کہ حکومت اس پر جلد عمل درآمد کرے گی (ڈان، 12 دسمبر، صفحہ 12)۔

ہندوستان پاکستان پانی کے معاملات:

8 ستمبر: ایک خبر کے مطابق پاکستان نے سندھ طاس معاہدے کی سنگین خلاف ورزیوں پر اپنے نان پیپرز (non-papers) ہندوستان کے حوالے کردیے ہیں (دی نیوز، 9 ستمبر، صفحہ 2)۔

28 ستمبر: نیلم۔جہلم ہائیڈرو پاور کمپنی کے چیف ایگزیکٹیو نے قومی اسمبلی کو بتایا کہ اس منصوبے کو مکمل ہونے میں ایک بلین ڈالر درکار ہوں گے اور اگر اس رقم کا انتظام نہ ہوسکا تو ہندوستان دریا نیلم پر کشن گنگا پروجیکٹ مکمل کرلے گا جس سے ہندوستان کو اس دریا پر سندھ طاس معاہدے کے تحت ترجیحی حقوق (priority rights) مل جائیں گے (دی نیوز، 29 ستمبر، صفحہ 3)۔

12 دسمبر: ایک خبر کے مطابق ہندوستان اس وقت توانائی حاصل کرنے کے 17 تعمیراتی پروگرام دریائے سندھ، جہلم اور چناب پر قائم کررہا ہے جس کی وجہ سے چناب اور جہلم کی دریاؤں میں پانی کا بہاؤ متاثر ہوا ہے (دی نیوز، 12 دسمبر، صفحہ 5)۔

II۔ زرعی مداخل

کھاد

2 جولائی: ایک خبر کے مطابق نیشنل فرٹیلائیزر مارکیٹنگ لمیٹڈ (NFML) نے ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان سے ایک خط کے ذریعے دریافت کیا ہے کہ بندرگاہوں پر برآمدی کھاد تھیلوں میں پیک ہوتے وقت بڑے پیمانے پر غائب کیسے ہورہی ہے؟ یہ کام ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان کے زیرنگرانی ہورہا ہے۔ ایک سے چھ کلوگرام فی تھیلا کھاد غائب ہورہی ہے۔ اس وقت 100,000 میٹرک ٹن کھاد برآمد کی گئی ہے (دی نیوز، 3 جولائی، صفحہ 18)۔

27 جولائی: ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان نے 50,000 ٹن یوریا درآمد کرنے کا سودا سوئٹزرلینڈ کی کمپنی کے ساتھ 419.39 ڈالر فی ٹن کے حساب سے طے کرلیا ہے (ایکسپریس ٹریبیون، 28 جولائی، صفحہ 10)۔

30 جولائی: ایک سائنسی ماہر کے مطابق مصنوعی کھاد اور پانی کے بے تحاشہ استعمال سے شمالی سندھ کی 15 فیصد اور جنوبی سندھ کی 21 فیصد زرعی زمین زراعت کے لیے بیکار ہوچکی ہے۔ اسی طرح بڑے بڑے زرعی رقبوں پر ایک ہی طرح کی فصل اگانے (monoculture) سے بھی زمین بنجر ہوتی جارہی ہے (ایکسپریس ٹریبیون، 31 جولائی، صفحہ 4)۔

III۔ غربت اور غذائی تحفظ

4 جولائی: اقوام متحدہ کی ملینیم ڈیولپمنٹ گولز (Millennium Development Goals/MDGs) رپورٹ 2012 کے مطابق پاکستان میں غذائی تحفظ کی صورتحال پچھلے چار سالوں میں ابتر ہوگئی ہے جس کی وجہ سے آبادی کی ایک بڑی تعداد کم غذا کی سطح سے نیچے گذارا کررہی ہے (ڈان، 5 جولائی، صفحہ 3)۔

24 جولائی: پاکستان ایکانومی واچ نے حکومت سے کہا ہے کہ وہ ملک میں غذائی تحفظ کے سنجیدہ انتظامات کرے کیونکہ بین الاقوامی غذائی بحران دنیا کو جلد اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔ امریکہ جو دنیا میں خوراک برآمد کرنے والا سب سے بڑا ملک ہے کو 1957 کے بعد اب بدترین خشک سالی کا سامنا ہے جس کی وجہ سے گندم، مکئی، سویابین وغیرہ کی قیمتوں میں اضافہ 2007-08 کی حد سے بھی بڑھ چکا ہے (ایکسپریس ٹریبیون، 25 جولائی، صفحہ 11)۔

27 جولائی: غربت کے اعداد وشمار میں پائے جانے والے تضادات کے حوالے سے پلاننگ کمیشن نے ایک اعلیٰ سطح کا کمیشن قائم کرنے کی تجویز پیش کی ہے جو خرچ کی بنیاد پر تحقیق کے طریقہ کار (methodology) کو درست کرتے ہوئے غربت پر نئے اعداد وشمار کا تعین کرے (دی نیوز، 28 جولائی، صفحہ 15)۔

30 جولائی: ایک خبر کے مطابق وفاقی حکومت نے خوراک کی کمی کے حوالے سے اپنے قومی پروگرام (National Zero Hunger Action Plan) جسے یوسف رضا گیلانی کی حکومت میں مارچ 2012 میں شروع کیا تھا کو اب پس پشت ڈال دیا ہے (ڈان، 31 جولائی، صفحہ 15)۔

27 اگست: لاہور میں ایک ورکشاپ میں ماہرین نے کہا کہ مائیکروکریڈیٹ، بےنظیر انکم سپورٹ پروگرام اور معاشی ترقی کی شرح میں اضافے سے خاطرخواہ نتائج نہیں حاصل ہوسکتے جب تک ان باتوں کو دور نہیں کیا جاتا جو غربت کا باعث ہیں (دی نیوز، 28 اگست، صفحہ 15)۔

5 ستمبر: پلاننگ کمیشن کی کمیٹی جس کی سربراہی ڈاکٹر ندیم الحق کررہے ہیں نے فیصلہ کیا کہ غربت کے اعداد وشمار کے حوالے سے 2005-06 سے قائم تضادات کو دور کرنے کے لیے پاکستان سماج اور معیار زندگی کو ناپنے کے لیے سروے (Pakistan Social and Living Standard Measurement Survey/PSLM 2010-11) کے ڈیٹا کو جاری کردیا جائے تاکہ تحقیق کرنے والے خود غربت کے حوالے سے کسی نتیجے پر

پہنچ سکیں (دی نیوز، 6 ستمبر، صفحہ 15)۔

24 ستمبر: ایک غیر سرکاری تحقیقی ادارے ایس ڈی پی آئی کے مطابق پاکستان میں آبادی کا ایک تہائی یا 58.7 ملین عوام غربت کی لکیر کے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔ دیہی علاقوں کے گھرانوں کا 46 فیصد اور شہری علاقوں کا 18 فیصد خط غربت سے نیچے ہے (دی نیوز، 24 ستمبر، صفحہ 3)۔

11 اکتوبر: 2012 کے عالمی بھوک کا انڈکس (Global Hunger Index) نے پاکستان میں بھوک کی صورتحال کو انتہائی تشویشناک قرار دیا ہے جبکہ پڑوسی ممالک ہندوستان اور بنگلہ دیش میں بھوک کی صورتحال کو کم تشویشناک (alarming) قرار دیا ہے۔ اس انڈکس کے تحت جنوبی ایشیاء عالمی بھوک کے انڈکس میں 22.5 کے اسکور کے ساتھ سرفہرست ہے (دی نیوز، 12 اکتوبر، صفحہ 18)۔

19 اکتوبر: پاکستان میں غذائی کمی کی سطح عالمی ادارہ صحت (World Health Organization/WHO) کے مطابق انتہائی درجے پر ہے۔ 2011 کے قومی غذائی سروے کے مطابق تقریباً 15.1 فیصد پاکستانی غذائی کمی کا شکار ہیں (ایکسپریس ٹریبیون، 19 اکتوبر، صفحہ 4)۔

30 نومبر: آغا خان یونیورسٹی کی طرف سے کراچی میں قومی کانفرنس برائے غذائیت (National Nutrition Conference) میں بتایا گیا کہ سندھ میں ہر دوسرا بچہ غذائی کمی کی وجہ سے متوازن نشو ونما نہیں حاصل کر پارہا اور زیادہ تر بچے وٹامن اے کی کمی کا شکار ہیں (دی نیوز، 30 نومبر، صفحہ 20)۔

3 دسمبر: اسلام آباد میں غذائی تحفظ پر پالیسی سازی کے حوالے سے اقوام متحدہ کے خوراک و زراعت کے ادارے (Food and Agriculture Organization /FAO)، ورلڈ فوڈ پروگرام (WFP) اور پاکستان اگیری کلچر ریسرچ کونسل (PARC) نے غذائی تحفظ کے محکمے کے ساتھ دو روزہ مشاورت کا سلسلہ شروع کیا۔ اس موقع پر وفاقی وزیر نے کہا کہ حکومت برازیل کے زیرو ہنگر (Zero Hunger) پروگرام پر بیرونی امداد کے ساتھ عمل درآمد کرنے کو تیار ہے (ڈان، 4 دسمبر، صفحہ 9)۔

12 دسمبر: اقوام متحدہ کے ادارے یونیسیف (UNICEF) کی پاکستان میں عورتوں اور بچوں کی حالت پر 2012 کی رپورٹ کے مطابق ملک میں جاری غربت بچوں اور عورتوں کی زندگی کے لیے خطرہ بنتی جارہی ہے۔ اگر یہ سلسلہ چلتا رہا تو پاکستان 2015 تک اپنی غربت میں کمی کے اہداف حاصل نہیں کر پائے گا (ڈان، 13 دسمبر، صفحہ 4)۔

13 دسمبر: پلاننگ کمیشن کی فوڈ باسکٹ (یعنی اہم غذائی اشیاء جو ایک گھرانے کے لیے ضروری قرار دی جائیں) پر رپورٹ کے مطابق خوراک کی باسکٹ کی قیمت 06-2005 سے 12-2011 کے دورانیہ میں 785 روپے سے بڑھ کر 1,805 روپے ہوگئی یعنی کہ فوڈ باسکٹ میں 300 فیصد اضافہ ہوا ہے (ڈان، 14 دسمبر، صفحہ 9)۔

27 دسمبر: اگیری فورم (Agri Forum) پاکستان کے چیئرمین محمد ابراہیم مغل نے لاہور میں ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ زرعی شعبے میں کم پیداوار کی وجہ سے 2012 میں 219 بلین روپے کا نقصان اٹھانا پڑا جس سے غذائی عدم تحفظ، غربت اور بے روزگاری میں اضافہ ہوا ہے (ڈان، 28 دسمبر، صفحہ 2)۔

مائیکرو کریڈیٹ:

29 ستمبر: حکومت پنجاب نے کسانوں کو مشورہ دیا کہ وہ ربیع کی فصل کے مداخل کے لیے قرضے حاصل کرنے کے لیے درخواست دیں۔ زرعی ترقیاتی بینک ربیع کے لیے قرضوں کی فراہمی پہلی اکتوبر 2012 کو شروع کرے گا (ڈان، 30 ستمبر، صفحہ 11)۔

4 دسمبر: اسٹیٹ بینک آف پاکستان نے مائیکرو فائنانس بینکوں کو پہلی دفعہ کریڈیٹ فائنانسنگ اسکیم (Credit Financing Scheme) کے ذریعے قرضے لینے (micro finance) کی سہولت دینے کا فیصلہ کیا (ڈان، 5 دسمبر، صفحہ 9)۔

5 دسمبر: کراچی میں پاکستان کی چھٹی مائیکرو فنانس کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے اسٹیٹ بینک کے ڈپٹی گورنر، قاضی عبدل مقتدر نے کہا کہ ایک بین الاقوامی فنڈ (International Strengthening Fund)، جو برطانوی گرانٹ پر مشتمل ہے نے اب تک 623 ملین روپے مائیکرو کریڈیٹ فراہم کرنے والے اداروں کو دیے ہیں جن میں اعلیٰ اور درمیانے درجے کے مائیکرو فنانس بینک اور ادارے شامل ہیں (ڈان، 6 دسمبر، صفحہ 9)۔

12 دسمبر: ایک خبر کے مطابق میڈا (Mennonite Economic Development Associates/MEDA) نے خوشحالی بینک کے ساتھ ایک ایم او یو (Memorandum of Understanding/MOU) پر دستخط کیے ہیں۔ میڈا مختلف ملکوں میں یو ایس ایڈ (United States Aid for International Development/USAID) کی مدد سے چھوٹے کاروبار کے منصوبوں کے فروغ کے لیے کام کرتا ہے۔ یو ایس ایڈ کی امداد سے چلنے والے اس پروجیکٹ کا مقصد ہے کہ یہ ملک میں 75,000 عورتوں کی آمدنی میں اضافہ کرے گا جو کہ دودھ کا کاروبار، شہد کی مکھیوں کو پالنا، دوا کے طور پر استعمال ہونے والی جڑی بوٹیوں کو جمع کرنے کا کام یا اور دیگر کام کرتی ہوں (دی نیوز، 13 دسمبر، صفحہ 18)۔

IV۔ غذائی فصلیں

25 ستمبر: ایک خبر کے مطابق وفاقی، صوبائی اور مقامی حکومتوں کی طرف سے قیمتوں کے نظام کی دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے پیپلز پارٹی کے ساڑھے چار سالہ دور حکومت

میں غذائی اشیاء کی قیمتوں میں تیزی سے اضافے سے عالمی اور مقامی کمپنیاں اپنی اجارہ داری قائم رکھنے میں کامیاب رہیں (ڈان، 26 ستمبر، صفحہ 9)۔

گندم

3 اگست: پاکستان کارپوریشن برائے زرعی ذخیرہ و خدمات (Pakistan Agriculture Storage and Services Corporation/PASSCO) کے چیئرمین جنرل (ریٹائرڈ) توقیر نے پبلک اکاؤنٹ کمیٹی (PAC) کو بتایا کہ ان کے ادارے نے گندم حاصل کرنے کی حکومتی مہم کے دوران گندم کے تھیلوں کی تقسیم میں بڑے پیمانے کی دھاندلی کا پتہ لگایا ہے (ایکسپریس ٹریبیون، 4 اگست، صفحہ 10)۔

28 اگست: فلور ملز ایسوسی ایشن (پنجاب) نے تیسری دفعہ گندم کی قیمتوں میں اضافہ کرتے ہوئے 20 کلو تھیلے کی قیمت 650 روپے کردی (ڈان، 29 اگست، صفحہ 2)۔

26 ستمبر: ایک خبر کے مطابق PASSCO (پاسکو) شدید مالی بحران کا شکار ہے کیونکہ 2007 سے اب تک گلگت بلتستان کی حکومت نے کارپوریشن کو واجب الادا 13 بلین روپے ادا نہیں کیے ہیں۔ اگر یہ پیسے فوری ادا نہیں کیے گئے تو کارپوریشن اگلے موسم کے لیے کسانوں سے گندم نہیں حاصل کرسکے گی (ایکسپریس ٹریبیون، 29 ستمبر، صفحہ 2)۔

15 اکتوبر: مرکزی وزارت برائے تحفظ خوراک کی ایک تحقیقی رپورٹ کے مطابق وفاقی حکومت نے سال بھر کے لیے گندم کے ذخائر کی موجودگی کے باوجود گندم کی قیمت میں اضافے پر اپنی تشویش کا اظہار کیا ہے۔ (ڈان، 16 اکتوبر، صفحہ 9)

12 نومبر: ایک خبر کے مطابق پیداواری قیمت میں اضافے کی وجہ سے پنجاب میں کسان گندم کی بوائی کا فیصلہ نہیں کرپا رہے ۔ ان کے مطابق پیداواری لاگت حکومت کی مقرر کردہ قیمت 1,050 روپے فی 40 کلو سے زیادہ ہوجائے گی (ایکسپریس ٹریبیون، 3 نومبر، صفحہ 10)۔

3 دسمبر: کابینہ کی اقتصادی رابطہ کمیٹی نے 23 نومبر کو گندم کی امدادی قیمت 1,200 روپے فی 40 کلو مقرر کرنے پر رضا مندی ظاہر کی تھی۔ اسٹیٹ بینک نے اپنی رپورٹ میں اس پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ یہ بینکوں سے لیے گئے حکومتی قرضے کو مزید بڑھائے گی جو اس وقت 436 بلین روپے ہے۔ اس حوالے سے پچھلے سال حکومت نے 38 بلین روپے کے قرضے لیے تھے (ڈان، 4 دسمبر، صفحہ 9)۔

چاول

2 اگست: ایک بزنس کانفرنس میں رائس ملز ایسوسی ایشن ڈسکہ، سیالکوٹ، کے صدر محمد اقبال گجر نے کہا کہ توانائی کے بحران کی وجہ سے ڈسکہ کے 27 چاول ملز مالکان نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ جلد اپنا کاروبار بنگلہ دیش منتقل کردیں گے (ڈان، 2 اگست، صفحہ 9)۔

20 ستمبر: کپاس کے بعد چاول کی فصل بھی وسطی پنجاب میں کیڑوں کے حملے کی زد میں آگئی ہے (ڈان، 21 ستمبر، صفحہ 2)۔

18 دسمبر: ایک خبر کے مطابق پاکستان میں ہائی بریڈ (hybrid) چاول تیزی سے مقبول ہورہا ہے۔ یہ چاول بلوچستان پنجاب اور سندھ میں تقریباً 300,000 ایکڑ پر کاشت ہورہا ہے جدید طریقوں پر کاشت کرنے والے ''پروگریسو'' یعنی روشن خیال کاشتکار اس سے 120-110 من فی ایکڑ تک پیداوار حاصل کررہے ہیں (ایکسپریس ٹریبیون، 19 دسمبر، صفحہ 11)۔

گنا

17 دسمبر: ایک انٹرویو میں کونسل آف فارمرز آرگنائزیشن کے چیئرمین جاوید جونیجو نے کہا کہ سندھ حکومت نے اس سال گنے کی قیمت کا اعلان 132 روپے فی 40 کلوگرام کیا ہے جو اگرچہ پچھلے سال کے مقابلے میں 20 فیصد زیادہ ہے لیکن کاشتکاروں کے لیے 200 روپے فی 40 کلوگرام سے کم قیمت فائدہ مند نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ تیل کی قیمتوں میں اضافہ اور ٹریکٹر ٹرالی جس میں گنے کو مل تک پہنچایا جاتا ہے کہ کرایوں میں اضافہ ہے (دی نیوز، 18 دسمبر، صفحہ 13)۔

۷۔ نقد آور فصلیں

تمباکو

3 جولائی: کسان بورڈ، چارسدہ ڈسٹرکٹ نے اعلان کیا کہ وہ تمباکو کے کاشتکاروں کے استحصال کے خاتمے اور امدادی قیمت پر جلد عمل درآمد کے مطالبے کے ساتھ، پاکستان ٹوبیکو بورڈ پشاور کا 4 جولائی کو گھیراؤ کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ حکومت نے تمباکو کی امدادی قیمت 183.40 روپے فی کلو مقرر کی ہے جبکہ کمپنی والے 117.60 روپے فی کلو پر خرید رہے ہیں (ڈان، 4 جولائی، صفحہ 5)۔

27 ستمبر: تمباکو کی کمپنیوں اور پاکستان ٹوبیکو بورڈ کے خلاف صوابی میں ایک کنونشن میں کاشتکار کوآرڈینیشن کونسل (Coordination Council) اور کسانوں کی مختلف تنظیموں نے دھمکی دی کہ وہ اگلے سال سے تمباکو کی کاشت نہیں کریں گے (ڈان، 27 ستمبر، صفحہ 5)۔

12 دسمبر: کاشتکاروں نے تمباکو کی مقرر کی گئی نئی قیمتوں کو رد کرتے ہوئے کہا کہ وہ پاکستان ٹوبیکو بورڈ کے خلاف تحریک شروع کریں گے (ڈان، 13 دسمبر، صفحہ 5)۔

کپاس

19 جولائی: حکومت نے پاکستان سینٹرل کاٹن کمیٹی (PCCC) کی تشکیل نو کی ہے تاکہ آنے والے سالوں میں کپاس پر تحقیق اور ترقی کو بہتر بنایا جائے۔ یہ کمیٹی اب 17 کے

بجائے 25 افراد پر مشتمل ہوگی جس میں کپڑے کی صنعت، روئی صاف کرنے والوں، کسانوں اور کراچی کاٹن ایسوسی ایشن کی نمائندگی ہوگی (ڈان، 20 جولائی، صفحہ 2)۔

1 اگست: مون سون کی بارشوں میں سردی کی وجہ سے پنجاب میں کپاس کی فصل پر پتہ مروڑ وائرس (Cotton Leaf Curl Virus/CLCV) نے حملہ کردیا ہے۔ یہ بیماری تیزی سے بڑھ رہی ہے اور اب تک 18.1 فیصد فصل کو متاثر کرچکی ہے (ڈان، 2 اگست، صفحہ 2)۔

2 اگست: اس سال کپاس کی کل پیداوار 14.5 ملین گانٹھوں (bales) پر مشتمل ہے جو 2011-12 کی 13.6 ملین گانٹھوں سے 6.3 فیصد زیادہ ہے۔ حکومت کا اس اچھی پیداوار کے پیش نظر خیال ہے کہ خام کپاس کی برآمدات 501.3 ملین ڈالر تک پہنچ جائیں گی (ڈان، 3 اگست، صفحہ 9)۔

10 دسمبر: بیسٹ کاٹن اینیشی ایٹیو (Best Cotton Initiative) جو دنیا میں کسانوں کو کیمیائی ادویات، فرٹیلائزر اور دیگر لوازمات کے بغیر کاشت کے طریقے سیکھانے کا پروگرام ہے کے علاقائی کوارڈینیٹر شفیق احمد نے کہا کہ پاکستان میں 75,000 سے زیادہ کسانوں نے 300,000 ایکڑ پر ایسے طریقوں سے کپاس اگا کر 80,000 میٹرک ٹن صاف کپاس حاصل کی ہے (دی نیوز، 11 دسمبر، صفحہ 18)۔

VI۔ تجارت

1 اکتوبر: ایگری کلچر پالیسی انسٹی ٹیوٹ (API) کے ایک عہدے دار کے مطابق ایک ایسی پالیسی جس کے تحت زرعی اجناس اور دیگر اشیاء کی قیمتوں کا تعین منڈی کی طاقتوں کے اختیار میں ہوگا اور قیمتوں کے تعین کے حوالے سے حکومتی کردار کے خاتمے کا سوچا جارہا ہے، زیرغور ہے۔ اس عہدہ دار کے مطابق اس پالیسی کا مقصد تمام متعلقہ فریقوں مثلاً اگانے والے بیچنے والے اور خریدنے والے کے حقوق کا تحفظ ہے۔ (ایکسپریس ٹریبیون، 2 اکتوبر، صفحہ 10)۔

درآمدات

20 جولائی: ادارہ برائے اعداد وشمار (Bureau of Statistics) کے مطابق 2011-12 پاکستان کے درآمدی بل میں تیل اور کھانے پینے کی اشیاء کی مد میں پچھلے سال کے مقابلے میں 18.24 فیصد اضافہ دیکھا گیا۔ یہ درآمدات 20.295 بلین ڈالر تک پہنچ چکی ہیں جو پاکستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ ہیں۔ یہ بات نا صرف تجارت کے خسارے میں اضافے کا باعث ہے بلکہ خوراک کی خودمختاری کے لیے بھی خطرہ ہے (ڈان، 21 جولائی، صفحہ 10)۔

5 دسمبر: لاہور میں ہندوستان پاکستان تجارت کے موضوع پر سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کسانوں کے نمائندوں نے مطالبہ کیا کہ یا تو وفاقی حکومت انہیں 12,000 روپے فی ایکڑ مراعات دے یا ہندوستان سے درآمد پر بھاری ڈیوٹی عائد کرے (ڈان، 6 دسمبر، صفحہ 2)۔

کپاس

2 دسمبر: ایک بیان میں پاکستان کاٹن جنرز ایسوسی ایشن نے کہا کہ حکومت ہندوستان سے کپاس کی درآمد پر ریگولیٹری ڈیوٹی عائد کرے۔ بیان میں کہا گیا کہ ہندوستان نے اپنے کسانوں کے بچاؤ کے لیے پاکستان سے چینی کی برآمد پر 100 فیصد ڈیوٹی بڑھا دی ہے (ڈان، 2 دسمبر، صفحہ 11)۔

درآمدی بھیڑیں

7 ستمبر: سندھ کے وزیر اعلیٰ کے مشیر حلیم عادل شیخ نے خط کے ذریعے سندھ کے چیف سیکریٹری کی توجہ اس خبر کے طرف دلائی ہے کہ آسٹریلیا سے لائی گئی 20 ہزار بیمار بھیڑوں کو پورٹ قاسم پر ایک خریدار کے حوالے کردیا گیا ہے۔ بھیڑوں کی بیماری انسانوں کو لگ کر ایک وبائی صورت پیدا کرسکتی ہے (دی نیوز، 8 ستمبر، صفحہ 20)۔

8 ستمبر: پاکستان میں آسٹریلیا کے ہائی کمیشن نے کہا کہ 21,000 بھیڑیں جو پاکستان لائی گئی ہیں ان میں کسی قسم کی بیماری نہیں ہے۔ اس خبر کے مطابق بھیڑوں کو بحرین میں اترنے سے اس لیے روک دیا گیا تھا کہ ان میں سکیبی ماؤتھ (scabbymouth disease) ڈیزیز دیکھی گئی تھی (ایکسپریس ٹریبیون، 9 ستمبر، صفحہ 11)۔

16 ستمبر: سندھ حکومت نے سرکاری طور پر فیصلہ کیا کہ آسٹریلیا سے لائی گئی 21,000 بھیڑوں کو تلف کردیا جائے۔ یہ فیصلہ دو لیبارٹریوں سے ان کی بیماری کی رپورٹوں کے بعد کیا گیا (ڈان، 7 ستمبر، صفحہ 1)۔

22 ستمبر: آسٹریلیا سے لائی گئی بھیڑوں کو تلف کرنے کے فیصلے کو فوری طور سے روک دیا گیا ہے۔ سندھ ہائی کورٹ کی پانچ ممبر کی کمیٹی نے معائنے کے بعد یہ بتایا کہ ان بھیڑوں میں کوئی بیماری نہیں ہے (ایکسپریس ٹریبیون، 23 ستمبر، صفحہ 9)۔

28 ستمبر: صوبائی اور وفاقی لیبارٹریوں سے متضاد رپورٹوں کے بعد سندھ ہائی کورٹ نے آسٹریلیا سے درآمد کی گئی بھیڑوں کی بین الاقوامی لیبارٹری سے ٹیسٹ کی رپورٹ طلب کی ہے (دی نیوز، 29 ستمبر، صفحہ 13)۔

برآمدات

گندم

19 جولائی: ایک خبر کے مطابق پاکستان اور ایران ایک ملین ٹن پاکستانی گندم کے بدلے ایرانی یوریا کے تجارتی معاہدہ طے کرنے میں ناکام ہوگئے ہیں (ڈان، 20 جولائی، صفحہ 14)۔

27 جولائی: ایک خبر کے مطابق امریکہ کی ریاستوں میں خشک سالی کی وجہ سے مکئی اور سویابین کی قیمتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔ پاکستان نے انڈونیشیا کو پچھلے ایک مہینے میں 50,000 ٹن مکئی فروخت کی ہے اور 115,000 ٹن گندم بھی مئی 2012 سے برآمد کی جاچکی ہے (ڈان، 28 جولائی، صفحہ 9)۔

7 اگست: وفاقی مشیر برائے موسمی تبدیلی، ڈاکٹر قمرالزمان چودھری نے صدر، وزیراعظم اور وفاقی وزیروں کو خط کے ذریعے باور کروایا کہ منڈلاتے ہوئے عالمی غذائی بحران اور پانی کی کمی کے پیش نظر حکومت کو فوری لائحہ عمل بنانے کی ضرورت ہے جس میں گندم کی برآمد اور اسمگلنگ دونوں کو روکنے پر اقدامات وضع کرنے چاہئیں (ڈان، 8 اگست، صفحہ 3)۔

5 اکتوبر: قومی وزارت برائے تحفظ خوراک اور تحقیق نے وزیراعظم راجہ پرویز اشرف کو بتایا کہ پاکستان کے پاس گندم کے 8.41 ملین ٹن اضافی ذخائر موجود ہیں جن میں سے ایک ملین ٹن گندم کو برآمد کیا جاسکتا ہے (ڈان، 6 اکتوبر، صفحہ 9)

چاول

13 جولائی: ایک خبر کے مطابق باسمتی ٹریڈ مارک رجسٹریشن کا مقدمہ (جو تین تنظیموں کے درمیان جھگڑے کا باعث بنا ہوا تھا) پر سندھ ہائی کورٹ نے سماعت مکمل کرلی ہے۔ یہ کیس مئی 2008 سے چل رہا تھا جب ٹریڈ مارک رجسٹرار نے باسمتی کا ٹریڈ مارک چاول اگانے والوں کی تنظیم بی جی اے (Basmati Growers Association /BGA) کو دے دیا۔ اس فیصلے کو چاول برآمد کرنے والی تنظیم، ریپ (Rice Exporters Association of Pakistan/REAP) اور تیار شدہ زرعی اشیاء اور خوراک کو برآمد کرنے والی ہندوستانی اتھارٹی اے پی ای ڈی اے (Agricultural and Processed Food Products Export Development Authority /APEDA) نے فوراً کورٹ میں چیلنج کردیا۔ ان کے مطابق ٹریڈ مارک رکھنے کی اجازت حکومت پاکستان کو ہونی چاہیے کسی نجی تنظیم کو نہیں۔ بی جی اے کے صدر حامد ملہی نے کہا کہ ان کی تنظیم ٹریڈ مارک رکھنے کی زیادہ حقدار ہے کیونکہ اس فصل سے ان کا لمبے عرصے کا مفاد وابستہ ہے (دی نیوز، 15 جولائی، صفحہ 15)۔

15 جولائی: ایک خبر کے مطابق ہندوستان کو تجارت میں پسندیدہ ملک قرار دیے جانے کے بعد پاکستان میں کاشتکار اور تاجر خوف میں ہیں۔ باسمتی چاول کاشت کرنے والوں کی تنظیم، بی جی اے کے صدر حامد ملہی نے کہا کہ ''ہم ہندوستان کو تجارت میں پسندیدہ ملک قرار دیے جانے کے خلاف نہیں، لیکن ہم ایک جیسے میدان میں کھیلنا چاہتے ہیں ورنہ ہماری تجارت کو بہت نقصان ہوگا کیونکہ دونوں ملکوں کی درآمدی ڈیوٹی کا کوئی مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ پاکستان میں چاول کی درآمدی ڈیوٹی صرف پانچ فیصد ہے جبکہ ہندوستان میں یہ ڈیوٹی 80 فیصد ہے''۔ ہندوستان نے گلف ممالک اور مشرق وسطی میں بھی 2011 سے چاول کی برآمد پر پابندی ہٹا کر اپنے سستے چاول سے پاکستانی چاول کی برآمد مشکل بنادی ہے (دی نیوز، 15 جولائی، صفحہ 15)۔

2 اگست: چاول کی برآمدات کو بڑھانے کے لیے سرمایہ کاری کے محکمے نے چاول کے مل مالکان کو ایک بلین کا قرضہ فراہم کرنے کا اعلان کیا ہے تاکہ وہ اپنی پرانی مشینیں وغیرہ تبدیل کرسکیں (ڈان، 3 اگست، صفحہ 18)۔

5 اگست: ایک خبر کے مطابق ریپ کے نمائندے نے بی جی اے کی پچھلے سالوں میں چاول کی برآمد نہ بڑھنے کی شکایت کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ چاول کی برآمد 01-2000 میں 462 ملین ڈالر تھی جو 11-2010 میں 2.091 بلین ڈالر ہوگئی ہے۔ ریپ کا کہنا ہے کہ اس کے ذریعے برآمد کرنے میں فائدہ یہ ہے کہ شکایت کی صورت میں برآمد کرنے والے کا فوراً آسانی سے پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ بی جی اے کے مطابق برآمد کے لیے ریپ کی رکنیت کو لازمی بنا کر اس کی چاول کی برآمد میں اجارہ داری قائم کردی گئی ہے (ایکسپریس ٹریبیون، 5 اگست، صفحہ 11)۔

8 اگست: چھوٹے اور درمیانے درجے کے تاجروں نے حکومت سے درخواست کی ہے کہ وہ ایران کے ساتھ مال کے بدلے مال کی تجارت میں گندم کے ساتھ چاول کو بھی شامل کرے (دی نیوز، 9 اگست، صفحہ 18)۔

30 نومبر: ریپ کے مطابق اس اقتصادی سال کے پانچ مہینوں میں پاکستانی باسمتی چاول کی برآمد میں 60 فیصد کمی ہوئی۔ یہ کمی پچھلے سال ہندوستان کی چاول کی برآمد پر پابندی ہٹانے کے بعد دیکھی گئی (دی نیوز، 1 دسمبر، صفحہ 15)۔

چینی

7 اگست: کابینہ کی اقتصادی رابطہ کمیٹی نے چینی پر برآمدی پابندی اٹھاتے ہوئے تاجکستان کو 30,000 ٹن چینی فروخت کرنے کا فیصلہ کرلیا (ایکسپریس ٹریبیون، 11 اگست، صفحہ 11)۔

پھل اور سبزیاں

3 جولائی: خیرپور ڈسٹرکٹ کے ایک گاؤں میں ہورٹیکلچر ٹریننگ پروجیکٹ (Horticulture Training Project) سے خطاب کرتے ہوئے سندھ کے سرمایہ کاری محکمے کی سیکریٹری ناہید شاہ نے کاشتکاروں کو مشورہ دیا کہ وہ روایتی فصلوں کے بجائے پھل اور سبزیاں اگائیں۔ ''اس سے ان کی معاشی حالت بہتر ہوگی'' (ایکسپریس ٹریبیون، 4 جولائی، صفحہ 11)۔

5 جولائی: سبزی ہول سیل مارکیٹ کے ترجمان کے مطابق بلوچستان میں توانائی کے بحران کی وجہ سے کاشتکاروں نے ٹیوب ویل ڈیزل سے چلانے شروع کردیے جس کی وجہ سے

پھلوں اور سبزیوں کی پیداواری قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔ بہت سے پھل کے باغات، خاص کر قلات کے علاقے میں کاٹے جاچکے ہیں۔ بلوچستان میں اب نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا سے درآمد کیے گئے پھل200 روپے فی کلو ملتے ہیں (دی نیوز، 5 جولائی، صفحہ18)۔

17 اگست: پاکستان پھل اور سبزی کے برآمدکنندگان و درآمدکنندگان اور مرچنٹس ایسوسی ایشن (Pakistan Fruit and Vegetable Exporters, Importers and Merchant Association/PFVA) کے مطابق پچھلے دس سالوں میں مستقل اضافے کے بعد پاکستان کے پھل اور سبزی کی تجارت میں 40 فیصد کمی آئی ہے (دی نیوز، 18 اگست، صفحہ16)۔

11 ستمبر: اسلام آباد میں امریکہ اور یورپی یونین سے غیر معیاری بنیاد پر پاکستانی پھل اور سبزیوں کے رد ہونے کی وجہ سے اقوام متحدہ کے خوراک و زراعت کے ادارے نے فوڈ سیکورٹی (تحفظ خوراک) بل اور پیسٹی سائیڈ (کیڑے مار زہر) ایکٹ کے جلد نفاذ پر مشاورت کا اہتمام کیا (ڈان، 12 ستمبر، صفحہ11)۔

آم:

3 جولائی: ایک خبر کے مطابق یو ایس ایڈ کے فرمز (FIRMS) پروجیکٹ (جس کا مقصد پاکستان میں کاروباری شعبہ کو فروغ دینا ہے جو کہ ملک کی برآمدات کو بڑھائے) سے سندھ اور پنجاب کے 17 آم کے باغوں کو عالمی اچھے زرعی طریقوں (Global Good Agriculture Practices) کا سرٹیفیکیٹ حاصل ہوا ہے۔ اس پروگرام کے تحت مزید 29 فارمز کو امداد دی جائے گی (ایکسپریس ٹریبون، 4 جولائی، صفحہ 10)۔

28 جولائی: PFVA (پی ایف وی اے) کے شریک چیئرمین، وحید احمد نے ایک بیان میں کہا کہ پاکستان 150,000 ٹن آم کی برآمد کا ہدف حاصل نہیں کرسکتا۔ برآمد صرف 100,000 ٹن ممکن ہے اس کی وجہ سمندری جہاز کی کمپنیوں اور ہوائی جہازوں کے کرائے میں اضافہ، ایران سے تجارت پر پابندی اور عالمی مارکیٹ میں چین اور ہندوستان کے سستے آم ہیں (دی نیوز، 29 جولائی، صفحہ 8)۔

4 اگست: ایک خبر کے مطابق پاکستانی آم کے معیار کی برآمد کے لیے منظوری کے بعد جنوبی کوریا سے تاجر افراد کی پاکستان آمد اس بات کا اشارہ ہے کہ آئندہ موسم میں کئی ہزار ٹن آم جنوبی کوریا برآمد کیے جائیں گے (ایکسپریس ٹریبون، 5 اگست، صفحہ 11)۔

5 اگست: کرایوں میں اضافے اور امریکی محکمے زراعت (یو ایس ڈی اے) اور دیگر اداروں کی طرف سے عائد پابندیوں کی وجہ سے اس سال پاکستانی آم کی امریکہ برآمد ممکن نہیں ہوگی (دی نیوز، 6 اگست، صفحہ 3)۔

آم برآمد کرنے کی امریکی شرائط

امریکی شرائط کو پورا کرنے کے لیے پاکستانی ایٹامک انرجی کمیشن نے آموں کے لیے تابکاری (irradiation plant) پلانٹ لگایا جس کی لاگت 300 ملین روپے تھی۔ لیکن امریکہ نے پلانٹ کو غیر اطمینان بخش قرار دے دیا۔ یو ایس ڈی اے نے پاکستان کو پابند کیا ہے کہ وہ صرف شیکاگو کے امریکن تابکاری پلانٹ سے یہ کام کروائیں (دی نیوز، 7 اگست، صفحہ3)۔

کھجور:

25 جولائی: ایک خبر کے مطابق یو ایس اپنے ایڈ فرمز (FIRMS) پروجیکٹ کے ذریعہ چھوٹے اور درمیانی (Small and Medium Enterprise/SME) کاروبار کی مدد کے لیے خیر پور اور سکھر ڈسٹرکٹ میں جہاں پاکستان کا 40 سے 50 فیصد کھجور پیدا ہوتا ہے، کھجور کی منڈی میں قیمت بڑھانے کے لیے ایک تجرباتی پروجیکٹ شروع کررہی ہے (ایکسپریس ٹریبیون، 26 جولائی، صفحہ10)۔

آڑو:

5 ستمبر: یو ایس ایڈ نے اعلان کیا کہ سوات، جہاں پاکستان کی 67 فیصد آڑو کی پیداوار ہوتی ہے، 600,000 ڈالر پر مبنی فرمز (FIRMS) پروجیکٹ کے ذریعے آڑو کے گودے کا کاروبار کرنے والے 449 چھوٹے اور درمیانے تاجروں کی تربیت کروائے گئی تاکہ وہ لوگ بہتر روزگار کما سکیں (ڈان، 6 ستمبر، صفحہ10)۔

کینو:

3 دسمبر: پاکستان سے کینو کی برآمدات کا سلسلہ پہلی دسمبر سے شروع ہوگیا ہے، برآمد کا ٹارگٹ 20,000 ٹن ہے (ڈان، 3 دسمبر، صفحہ10)۔

27 دسمبر: سمندری جہاز کی کمپنیوں کے کرائے میں اضافے کے فیصلے کے بعد پھل برآمد کرنے والوں نے کینو کی برآمد کے لیے مراعات کا مطالبہ کردیا (دی نیوز، 28 دسمبر، صفحہ18)۔

مال مویشی

25 جولائی: پشاور ہائی کورٹ نے مال مویشی کی افغانستان اسمگلنگ اور برآمد کا سوموٹو نوٹس لیتے ہوئے اگلی پیشی تک مال مویشی کی افغانستان برآمد روکنے کا حکم جاری کیا۔ مال مویشی کی برآمدات اور اسمگلنگ سے مقامی سطح پر گوشت کی قیمتیں عوام کی قوت خرید سے باہر نکل چکی ہیں (ڈان، 24 جولائی، صفحہ5)۔

مچھلی

24 جولائی: چیئرمین فشری ایکسپورٹرز ایسوسی ایشن آف پاکستان، فیصل افتخار نے کہا کہ مچھلی کی برآمدات نے پاکستان میں یورپی ممالک کی طرف سے پابندی کے باوجود 300 ملین کی حد پار کرلی ہے۔ یورپ کے مقابلے میں چین کو مچھلی کی برآمدات سے پاکستان کو بہتر قیمت مل رہی ہے۔ سعودی عرب، مصر اور مشرق وسطیٰ کے دیگر ممالک بھی پاکستان سے مچھلی کی برآمدات کے لیے بڑی مارکیٹ ہیں (ڈان، 25 جولائی، صفحہ 9)۔

Vii۔ ماہی گیری

23 ستمبر: ایک تحقیق کے مطابق موسمی تبدیلی، ماحولیاتی آلودگی، مچھلی پکڑنے میں بے احتیاطی اور دریائی پانی کی ذیلی علاقوں میں کمی نے دریا سندھ کے بڑے جھینگوں اور دیگر اقسام کو ختم کرنا شروع کردیا ہے (ڈان، 24 ستمبر، صفحہ 16)۔

Viii۔ کارپوریٹ

1 جولائی: اینگرو فوڈ لمیٹڈ نے منافع کے بعد ٹیکس کا اعلان کرتے ہوئے بتایا کہ جنوری تا جون کے عرصے میں کمپنی نے 1.01 بلین روپے کا منافع کمایا (دی نیوز، 18 جولائی، صفحہ 15)۔

13 جولائی: سستی درآمدی کھاد کی وجہ سے فوجی فرٹیلائزر بن قاسم کا منافع جنوری تا جون 2012 میں 644 ملین روپے تھا جبکہ ایک سال پہلے اسی دورانیہ میں یہ منافع 3.5 بلین روپے بتایا جاتا ہے (ایکسپریس ٹریبیون، 14 جولائی، صفحہ 11)۔

25 جولائی: ایک خبر کے مطابق 2012 کے پہلے چھ مہینوں میں سوئی ناردن سے گیس حاصل کرنے والی تین کمپنیوں کا مجموعی نقصان 5.5 بلین روپے رہا (ڈان، 20 جولائی، صفحہ 9)۔

7 اگست: نیسلے کارپوریشن کے منافع میں اس سال کے پہلے چھ مہینوں میں 11 فیصد اضافہ ظاہر کیا گیا۔ پچھلے سال کمپنی کا چھ مہینوں کا منافع 2.63 بلین روپے تھا، اس سال یہ 2.91 بلین روپے ہے (دی نیوز، 8 اگست، صفحہ 15)۔

8 اگست: اینگرو فوڈ کے چیف ایگزیکٹیو آفیسر نے بتایا کہ ان کی کمپنی اپنے حلال گوشت کی برانڈ، الشفا حلال، کو کینیڈا میں متعارف کرائے گی۔ اینگرو پاکستان کی پہلی کمپنی ہوگی جو خوراک کے 632 بلین ڈالر کے عالمی کاروبار میں اپنا مقام بنوائے (ایکسپریس ٹریبیون، 9 اگست، صفحہ 4)۔

ایگری بزنس:

12 دسمبر: ایگری بزنس منصوبوں کو فروغ دینے کے لیے یو ایس ایڈ اور 12 پاکستانی این جی اوز کے درمیان اسلام آباد میں ایک معاہدے پر دستخط ہوئے۔ اس پروجیکٹ میں 3,000 کسانوں کے گروپ بنائے جائیں گے جنھیں اپنی اشیاء کو بہتر بنانے اور بیچنے کے طریقے سکھائے جائیں گے (ایکسپریس ٹریبیون، 13 دسمبر، صفحہ 10)۔

14 دسمبر: ایک خبر کے مطابق اس سال 13 جدید ڈیری فارمز کو قائم کرنے میں مدد دے کر چھوٹے اور درمیانے کاروبار کی ترقی کی اتھارٹی (Small and Medium Enterprises Development Authority/SMEDA) نے 400 ملین روپے کی سرمایہ کاری کو فروغ دیا ہے (دی نیوز، 15 دسمبر، صفحہ 18)۔

IX۔ ماحول

18 جولائی: ایک سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے خیبر پختونخواہ کے ماحول اور جنگلات کے وزیر، واجد علی خان نے کہا کہ ان کے صوبے میں جنگلات کی زمین 17 فیصد سے بڑھ کر 19 فیصد تک ہوگئی ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ان کی حکومت نے ایک نجی کمپنی کے ساتھ ریڈ میکانزم (Reducing Emissions from Deforestation and Forest Degradation/REDD) کے لیے ایم او یو پر دستخط کیے ہیں۔ اس حوالے سے دیگر اقدامات اور شرائط پر بات چیت جاری ہے (ڈان، 19 جولائی، صفحہ 5)۔

1 اگست: ایک خبر کے مطابق کھجور کے درختوں پر ایک قسم کا کیڑا جو پانچ سال پہلے ایران سے پاکستان میں پھیلا، پنجگور میں 90 فیصد کھجور کے درختوں کو تباہ کرچکا ہے۔ سندھ میں اس کے پھیلنے کا خطرہ ہے۔ کیمیائی ادویات اس پر بے اثر ہیں لیکن نیم کے پتوں سے بنائی گئی قدرتی دوائی اس پر کارگر ثابت ہورہی ہے (ایکسپریس ٹریبیون، 9 اگست، صفحہ 15)۔

13 اگست: ایک خبر کے مطابق نیلم جہلم وادی میں ایک پاور پروجیکٹ کے لیے دو سرنگیں بنانے سے علاقے میں 600 پانی کے چشمیں خشک ہوگئے (ایکسپریس ٹریبیون، 13 اگست، صفحہ 4)۔

14 اگست: کم خوراک کی وجہ سے تھر میں مور بڑی تعداد میں مر رہے ہیں کیونکہ وہاں کے مکین جو ان کو خوراک فراہم کرتے تھے کہ پاس خود خشک سالی کی وجہ سے کھانے کو نہیں ہے (ڈان، 14 اگست، صفحہ 14)۔

29 اگست: ورلڈ وائیڈ فنڈ فار نیچر (World Wide Fund for Nature/WWF) کے مطابق اگر فوری اقدامات نہ کیے گئے تو پاکستان میں جنگلات 15 سالوں میں مکمل طور پر ختم ہوجائیں گے (ڈان، 30 اگست، صفحہ 5)۔

15 ستمبر: ایک خبر کے مطابق کراچی کی صرف 10 فیصد فیکٹریاں ماحولیاتی معیار کی پابند ہیں اور پاکستان میں صرف تین فیصد فیکٹریاں کچرے کو ٹھکانے لگانے کے بین الاقوامی ضوابط پر عمل کرتی ہیں (ایکسپریس ٹریبیون، 16 ستمبر، صفحہ 14)۔

12 دسمبر: ایک خبر کے مطابق کوٹری سے کلری بگیھار فیڈر جس کے ذریعے کراچی تک پانی پہنچتا ہے ٹھٹھہ کی کینجھر جھیل میں زہریلی آلودگی پھیلا رہا ہے اور سمندری حیات، چڑیوں اور مال مویشی حالیہ دنوں میں ہلاک ہوئے۔ کوٹری شہر کے سائٹ کے علاقوں کا گندا پانی بھی اس نہر میں جاتا ہے جو کوٹری شہر اور کوٹری سے ٹھٹھہ تک کے دیہی علاقوں کے لوگوں کے لیے خطرے کا باعث ہے کیونکہ وہاں کوئی پانی صاف کرنے کا پلانٹ نہیں ہے (ایکسپریس ٹریبیون، 12 دسمبر، صفحہ 13)۔

13 دسمبر: انٹرنیشنل سینٹر فار انٹگریٹیڈ ماؤنٹین ڈیولپمنٹ (International Centre for Integrated Mountain Development/ICIMOD) اور ڈبلیو ڈبلیو ایف کی ایک ورکشاپ میں بتایا گیا کہ کوٹری کے زیریں علاقوں میں تازے پانی کی کمی مینگروز (mangroves) کے جنگلات کے خاتمے کی بڑی وجہ ہے۔ آئی سی آئی ایم او ڈی (ICIMOD) اس علاقے میں یو این ریڈ پلس (UNREDD plus) پروجیکٹ شروع کرنا چاہتا ہے (ایکسپریس ٹریبیون، 14 دسمبر، صفحہ 15)۔

19 دسمبر: ہنی بی ریسرچ انسٹیٹیوٹ (Honeybee Research Institute) نے اپنی ایک تحقیق سے ثابت کیا کہ جنوبی پنجاب کے آم کے باغوں میں شہد کے چھتے کم ہورہے ہیں۔ اس سے شہد کی پیداوار میں کمی کے ساتھ ساتھ علاقے میں دیگر اچھے پھلوں کی پیداوار بھی متاثر ہوئی ہے کیونکہ شہد کی مکھی پودوں کے درمیان عمل زیرگی کا ذریعہ (pollinators) ہوتی ہیں (دی نیوز، 20 دسمبر، صفحہ 18)۔

X۔ موسمی تبدیلی

5 جولائی: پاکستان کے موسمیات کے محکمے کے مطابق اس سال ملک کی تاریخ میں گرمی کی شدت کا سب سے لمبا دورانیہ ریکارڈ کیا گیا (دی نیوز، 5 جولائی، صفحہ 15)۔

27 جولائی: ایک خبر کے مطابق موسمی تبدیلی کے محکمے کے کلین ڈیولپمنٹ میکانزم سیل (Clean Development Mechanism Cell) کے آٹھ ماہرین کی ملازمت کی معیاد ختم ہونے کے بعد کمپنیوں کو کاربن کریڈیٹ پروجیکٹ رجسٹر کرانے کے لیے دشواری کا سامنا ہے۔ اقوام متحدہ کے فریم ورک کنونشن برائے موسمی تبدیلی (UNFCCC) سے کاربن کریڈیٹ لینے کی آخری تاریخ 31 دسمبر ہے۔ اس کے بعد یورپی یونین سے کاربن کریڈیٹ حاصل نہیں کیے جاسکیں گے جو اس کی سب بڑی مارکیٹ ہے (ڈان، 28 جولائی، صفحہ 4)۔

19 اگست: قدرت کے تحفظ کی عالمی یونین (International Union for Conservation of Nature/IUCN) کی ایک رپورٹ کے مطابق موسمی تبدیلی سے پاکستان میں عورتیں زیادہ متاثر ہورہی ہیں، خاص کر پہاڑی علاقوں میں جہاں 50-63 فیصد گھرانوں کے مرد روزگار کے لیے نقل مکانی کرتے ہیں (دی نیوز، 20 اگست، صفحہ 5)۔

24 دسمبر: صدر آصف زرداری نے ملک کے پہلے ونڈ مل پروجیکٹ کا جھمپیر ٹھٹھہ میں افتتاح کیا۔ فوجی فرٹیلائزر کمپنی انرجی لمیٹڈ کا یہ پروجیکٹ 33 جرمن ٹربائنز کے ذریعے 50 میگاواٹ بجلی پیدا کرے گا (ایکسپریس ٹریبیون، 25 دسمبر، صفحہ 10)۔

29 دسمبر: ایک تحقیقی رپورٹ جس میں پاکستان کے 56 موسمیاتی مراکز سے مواد اکٹھا کیا گیا ہے میں یہ بتایا گیا ہے کہ پاکستان اس جغرفیائی خطے میں ہے جہاں درجہ حرارت میں اضافہ عالمی اوسط سے زیادہ ہوگا۔ لہذا پاکستان موسمی تبدیلی کے حوالے سے حساس ترین ملک شمار کیا جاسکتا ہے (ڈان، 30 دسمبر، صفحہ 19)۔

XI۔ قدرتی آفات

19 جولائی: ایک خبر کے مطابق عالمی بینک نے بلوچستان ڈیزاسٹر منیجمنٹ (قدرتی آفات سے نمٹنے کے انتظام) پروجیکٹ کے لیے پانچ ملین ڈالر منظور کیے ہیں۔ اس امداد سے صوبائی ڈیزاسٹر منیجمنٹ اتھارٹی کو بھی مضبوط کیا جائے گا (ڈان، 20 جولائی، صفحہ 3)۔

21 جولائی: ایک رپورٹ جسے آبپاشی کے محکمے کی ٹیکنیکل مدد سے تیار کیا گیا ہے میں یہ بتایا گیا کہ پنجاب کے آبپاشی کے محکمے نے 104 حفاظتی بند (dykes) کی ضروری مرمت اب تک نہیں کی ہے۔ پنجاب کے 24 اضلاع میں دریا کے کناروں پر حفاظتی بند 2010 کے سیلاب میں متاثر ہوئے تھے (ایکسپریس ٹریبیون، 22 جولائی، صفحہ 15)۔

25 جولائی: NDMA (این ڈی ایم اے) کے چیئرمین ڈاکٹر ظفر قادر نے اعلان کیا کہ حکومت قدرتی آفات سے نمٹنے کے لیے بیمہ پالیسی کی سہولت دینے پر غور کررہی ہے۔ یہ بیمہ پالیسی پروگرام جو جانی نقصان، روزگار، گھر اور مال مویشی کے لیے ہوگا دنیا میں سب سے بڑی بیمہ پالیسی کا پروگرام ہوگا (ایکسپریس ٹریبیون، 26 جولائی، صفحہ 4)۔

26 جولائی: کراچی میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے سندھ پیپلز کمیشن فار ڈیزاسٹر پریوینشن (Sindh People's Commision for Disaster Prevention) یعنی آفات روکنے کے لیے عوامی کمیشن کے مقررین نے کہا کہ 2010 کے سیلاب اور 2011 کی بارشوں سے متاثر افراد کی بڑی تعداد اب بھی بحال نہیں ہوسکی ہے (ڈان، 27 جولائی، صفحہ 5)۔

26 جولائی: سرکاری ذرائع کے مطابق فنڈز کی کمی کے باعث صوبہ خیبر پختونخواہ میں زلزلے سے متاثرہ علاقوں میں 2,500 منصوبوں میں سے 50 فیصد 2012-13 میں ختم

ہوجائیں گے (ڈان، 29 جولائی، صفحہ 5)۔

19 اگست: سندھ حکومت نے تھر کے 95 فیصد علاقے کو خشک سالی سے متاثر علاقہ قرار دے دیا (ایکسپریس ٹریبیون، 28 اگست، صفحہ 13)۔

10 ستمبر: شمالی سندھ، پنجاب میں راجن پور، ڈی جی خان اور مشرقی بلوچستان میں تیز بارشوں نے 24 سال کا ریکارڈ توڑتے ہوئے ایک بڑے رقبے کو سیلاب کی لپیٹ میں لے لیا جس میں 100 سے زیادہ لوگ جان بحق ہوئے (ڈان، 11 ستمبر، صفحہ 1)۔

16 ستمبر: سندھ میں بارش سے متاثر علاقوں کے لیے وزیراعظم راجہ پرویز اشرف نے دو بلین روپے امداد کا اعلان کیا (ڈان، 17 ستمبر، صفحہ 1)۔

23 ستمبر: وزیراعظم راجہ پرویز اشرف نے بلوچستان کے سیلاب سے متاثر علاقوں کے لیے 2.6 بلین روپے کی امداد کا اعلان کیا (ڈان، 24 ستمبر، صفحہ 1)۔

27 ستمبر: سیلاب متاثرین کے لیے یورپی یونین نے 15 ملین یورو کی امداد کا اعلان کیا (ڈان، 29 ستمبر، صفحہ 14)۔

28 ستمبر: سیلاب کے بعد سندھ چیمبر آف ایگریکلچر نے زرعی شعبے کی بحالی کے لیے 10 بلین روپے اور کسانوں کو قرضوں کی ادائیگی سے چھوٹ کا مطالبہ کیا (ڈان، 29 ستمبر، صفحہ 18)۔

29 ستمبر: سندھ کے وزیر اعلیٰ نے ان کسانوں کو جنہوں نے اپنے گھر والوں کا حالیہ بارشوں میں جانی نقصان برداشت کیا کو 0.3 ملین (تین لاکھ) روپے فی کس کی امداد تقسیم کی (ایکسپریس ٹریبیون، 30 ستمبر، صفحہ 15)۔

4 دسمبر: شکارپور ڈسٹرکٹ میں لوگ اب بھی سیلاب کے مسائل سے دوچار ہیں۔ بڑے علاقوں سے پانی ابھی تک نہیں نکالا جاسکا ہے اور لوگ گندے پانی سے پیدا ہونے والی بیماریوں اور جلد کے امراض میں گرفتار ہیں (ڈان، 5 دسمبر، صفحہ 18)۔

9 دسمبر: حیدرآباد میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے سندھ کے وزیر اعلیٰ کے مشیر علیم عادل شیخ نے کہا کہ بارشوں اور سیلاب کے تین مہینے بعد بھی سندھ کے سات اضلاع میں 141,000 افراد بے گھر ہیں۔ اس حوالے سے انہوں نے حکومت کے محکموں اور بین الاقوامی امدادی اداروں کو تنقید کا نشانہ بنایا (ایکسپریس ٹریبیون، 10 دسمبر، صفحہ 14)۔

27 دسمبر: امریکی محکمے توانائی کی ایک تحقیقی رپورٹ کے مطابق قدرتی بحرانوں کے شکار 13 ممالک میں لوگوں کی بحران کے بعد زندگی دوبارہ جاری رکھنے کی صلاحیت (human resilience) کم ہو رہی ہے جبکہ پاکستانی عوام میں اس حوالے سے اضافہ دیکھا گیا ہے (ڈان، 28 دسمبر، صفحہ 14)۔

28 دسمبر: سندھ کے بارش سے متاثر علاقوں میں خسرے کی وبا سے پچھلے 28 دنوں میں 90 بچے جاں بحق ہو چکے ہیں۔ وزیر اعلیٰ سندھ، سید قائم علی شاہ نے اس پر کمشنر سکھر اور میرپور خاص سے تفصیلی رپورٹ مانگی ہے (دی نیوز، 28 دسمبر، صفحہ 5)۔

28 دسمبر: SMEDA (سمیڈا) نے یورپی یونین اور اقوام متحدہ پروگرام برائے ترقی (یو این ڈی پی) کے تعاون سے 29 اضلاع میں 2010 کے سیلاب سے متاثر افراد کی معاشی بحالی کا پروگرام مکمل ہونے کا اعلان کیا۔ اس پروگرام نے کاروبار اور روزگار کے لیے جولائی 2011 سے 189.9 ملین روپے کی امداد 11,928 افراد اور 116 اداروں کو فراہم کی (دی نیوز، 29 دسمبر، صفحہ 18)۔

XI۔ مزاحمت

8 جولائی: سندھ قوم پرست پارٹیوں کے کارکنان نے مکلی سے ٹھٹھہ تک جلوس نکال کر ذوالفقار آباد کے منصوبے کے خلاف احتجاج کیا (ڈان، 9 جولائی، صفحہ 16)۔

11 جولائی: سندھ کے نو اضلاع میں پانی کی کمی کے خلاف عوامی پارٹی اور سندھ ہاری پورھیت کونسل کے نمائندوں نے اس بھوک ہڑتال میں اظہار یکجہتی کے طور پر شرکت کی جو کسان اپنے حقوق کے لیے پچھلے 47 دنوں سے خیرپور میں کر رہے ہیں (ڈان، 12 جولائی، صفحہ 18)۔

12 جولائی: جئے سندھ قومی محاذ نے چین کی تمام اشیاء کے بائیکاٹ کا اعلان کیا کیونکہ چین کا ذوالفقار سٹی پروجیکٹ میں سرمایہ کاری کا ارادہ ہے۔ صوبے بھر میں حکومت اور چین کے خلاف مظاہروں کا اعلان بھی کیا گیا (دی نیوز، 13 جولائی، صفحہ 13)۔

15 جولائی: گلگت کی دیامیر ڈسٹرکٹ کی تھور وادی میں گاؤں والوں نے زبردستی واپڈا اسٹاف کالونی میں جاری کام رکوا دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ آدھی وادی بھاشا ڈیم کی نظر ہوگئی ہے اور آدھی پر واپڈا کی اسٹاف کالونی بن رہی ہے (ڈان، 16 جولائی، صفحہ 5)۔

25 جولائی: تمباکو کے کاشتکاروں نے صوابی میں چار باغ کے مقام پر ایک بین الاقوامی کمپنی کے باہر اپنی فصل کو آگ لگا دی۔ وہ فصل کی کم قیمت لگانے کے خلاف مظاہرہ کر رہے تھے (ڈان، 26 جولائی، صفحہ 5)۔

3 اگست: پانی کی کمی کے خلاف مختلف گاؤں سے شریک چاول کے کاشتکاروں نے لاڑکانہ میں مظاہرہ کیا (ڈان، 4 اگست، صفحہ 18)۔

6 اگست: کسان مرد، عورتوں اور بچوں نے حیدرآباد پریس کلب کے باہر سانگھڑ میں کھپرو کے زمیندار کے خلاف مظاہرہ کیا۔ زمیندار نے 28 کسانوں کو اغواء کر کے تین مہینے تک اپنی قید میں رکھا تھا، چار مزدور اب بھی اس کی قید میں ہیں (ڈان، 7 اگست، صفحہ 18)۔

9 اگست: منگلا ڈیم میں پانی کی سطح انتہائی حد تک بلند کرنے سے متاثرہ افراد نے بڑی تعداد میں میرپور، آزاد کشمیر میں مظاہرہ کیا۔ حکومت ان کی آبادکاری کے لیے کوئی مناسب انتظام کرنے میں اب تک ناکام ہے (ایکسپریس ٹریبیون، 10 اگست، صفحہ 15)۔

5 ستمبر: کاشتکاروں کی بڑی تعداد نے نوابشاہ ہائی وے پر محصولات محکمے کے سرکنڈ تعلقہ میں زمینوں پر زبردستی قبضے کے خلاف مظاہرہ کیا۔ 40 کاشتکاروں نے کہا کہ اگر انہیں اپنی زمین زبردستی بیچنے پر مجبور کیا گیا تو وہ پریس کلب کے باہر احتجاجی خودکشی کریں گے (ڈان، 6 ستمبر، صفحہ 18)۔

16 ستمبر: ایک خبر کے مطابق 2 مئی، 1998 کو ایک بااثر زمیندار نے مانو بھیل کے خاندان کے آٹھ افراد کو اغوا کیا تھا۔ اس کے خلاف مانو بھیل کی پچھلے 1,287 دنوں سے حیدرآباد میں جزوی (ٹوکن) بھوک ہڑتال جاری ہے (ڈان، 17 ستمبر، صفحہ 16)۔

22 ستمبر: کسانوں کے مسائل پر سندھ ہاری کمیٹی کے صدر، غلام رسول سہتو کی 100 دن سے اوپر کی بھوک ہڑتال پاکستان پیپلز پارٹی کی طرف سے مطالبات کی منظوری کی یقین دہانی کے بعد اسلام آباد میں ختم ہوگئی (ایکسپریس ٹریبیون، 23 ستمبر، صفحہ 4)۔

2 دسمبر: مالم جبا کے مختلف قبائل کے ہزاروں لوگوں نے علاقے میں لکڑی کی اسمگلنگ اور جنگلات کی کٹائی کے خلاف مظاہرہ کیا (ایکسپریس ٹریبیون، 3 دسمبر، صفحہ 4)۔

5 دسمبر: حیدرآباد میں پاکستان فشرفوک فورم (PFF) اور دیگر افراد نے کالا باغ اور بھاشا ڈیم کے خلاف مظاہرہ کیا اور سندھ اسمبلی سے کہا کہ وہ ان کے خلاف قرارداد پاس کرے (ڈان، 6 دسمبر، صفحہ 18)۔

ب۔ عالمی خبریں

I۔ زرعی مواد

زمین

7 جولائی: ایک مضمون کے مطابق شمال مشرقی ہیٹی میں 2010 کے زلزلے سے متاثرہ 366 کسانوں سے ان کی زرخیز زمین ہتھیانے کے بعد وہاں نیا صنعتی پارک بنایا جارہا ہے۔ اس حوالے سے زلزلہ بحالی کمیشن کے شریک چیئرمین، امریکہ کے سابق صدر بل کلنٹن، نے جنوبی کوریا کی کپڑے کی کمپنی (جو امریکہ کی وال مارٹ اور گیپ کو مال سپلائی کرتی ہے) سے معاہدہ کیا ہے۔ اس صنعتی پارک کے لیے کمپنی کو ٹیکس کی چھوٹ، امریکہ میں ڈیوٹی فری مال لے جانے کی اجازت اور ہیٹی سے خوب سستے مزدور کے علاوہ دیگر مراعات ملیں گی (ایکسپریس ٹریبیون، 7 جولائی، صفحہ 2)۔

پانی

8 اگست: نیچر رسالے کے ایک مضمون کے مطابق، کثیر آبادی کے علاقوں ایشیاء، مشرق وسطیٰ اور امریکہ میں مٹی کی پٹی کے کچھ علاقوں میں زیرزمین پانی کو خطرناک ترین سطح سے نکالا جارہا ہے یعنی وہ سطح جہاں پانی ہزاروں سال پہلے سے موجود تھا اور جس کو واپس لوٹانا اب انسان کے لیے ناممکن ہے (ڈان، 9 اگست، صفحہ 15)۔

24 اگست: سری لنکا کے پانی کے ادارے کے مطابق ان کے ایک تجرباتی منصوبے سے معلوم ہوا ہے کہ جنوبی ایشیاء اور افریقہ کے کچھ علاقوں میں جہاں کسان اپنے چھوٹے آبپاشی کے منصوبے خود چلاتے ہیں وہاں پیداوار میں 300 فیصد تک اضافہ ممکن ہوجاتا ہے (ایکسپریس ٹریبیون، 25 اگست، صفحہ 11)۔

II۔ غربت اور غذائی تحفظ

5 جولائی: اقوام متحدہ کے عالمی معاشی اور معاشرتی (ورلڈ اکنامک اینڈ سوشل) سروے نے دنیا کے امیر ترین لوگوں پر سالانہ ایک فیصد ٹیکس عائد کرنے کی سفارش کی ہے۔ اس سے غریب ممالک کو دینے کے لیے 2012 میں 400 بلین ڈالر حاصل ہوسکتے ہیں (دی نیوز، 6 جولائی، صفحہ 10)۔

20 جولائی: افریقہ میں شمالی مالی میں خانہ جنگی کی وجہ سے ساحل کے علاقے میں نقل مکانی کرکے آنے والے پناہ گزینوں کی وجہ سے خوراک کا بحران مزید بڑھ گیا۔ شمالی افریقہ کے اس علاقے میں آٹھ ممالک کے 18 ملین افراد خشک سالی اور خوراک کی کمی میں پچھلے سال سے مبتلا ہیں (ڈان، 21 جولائی، صفحہ 12)۔

30 اگست: عالمی بینک کے مطابق امریکہ اور مشرقی یورپ میں خشک سالی کی وجہ سے عالمی خوراک کی قیمتوں میں دس فیصد اضافہ دنیا کے غریب ترین لوگوں کے غذائی تحفظ کے لیے خطرہ ہیں (ڈان، 30 اگست، صفحہ 11)۔

17 ستمبر: فرانس نے عالمی سطح پر ضروری غذائی اشیاء کا ذخیرہ قائم کرنے کی سفارش کی ہے۔ ایف اے او نے اس کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ اس سے قیمتوں کے بڑھتے ہوئے رجحان کے اثرات سے بچنے میں مدد ملے گی (ڈان، 18 ستمبر، صفحہ 9)۔

25 ستمبر: ایف اے او کے ورلڈ فوڈ پروگرام (WFP) نے یمن کے لیے مزید امداد کی درخواست کی ہے جہاں 10 ملین افراد یا ملک کی آدھی آبادی کم خوراک اور بھوک میں مبتلا ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ بچے اس ملک میں غذائی کمی کا شکار ہیں (دی نیوز، 26 ستمبر، صفحہ 10)۔

9 اکتوبر: ایف اے او کی غذائی عدم تحفظ پر رپورٹ کے مطابق 2010-2012 کے

دوران 570 ملین افراد شدید غذائی کمی کا شکار رہے اور دنیا میں بھوکے افراد کی تعداد ناقابل قبول حد تک برقرار ہے، یعنی ہر آٹھواں فرد شدید بھوک کا شکار ہے (ایکسپریس ٹربیون،10 اکتوبر،صفحہ12)

3 دسمبر: یورو اسٹیٹ (Eurostat) کے اعداد و شمار کے مطابق یورپی یونین میں غربت کے خطرے کی زد میں لوگوں کی تعداد 120 ملین تک ہوگئی ہے (ڈان، 3 دسمبر، صفحہ 11)۔

6 دسمبر: ایف اے او کی ایک تازہ رپورٹ کے مطابق دنیا میں لوگوں میں ناختم ہونے والی غذا کی کمی اور غذائی قیمتوں میں اضافے کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ اب غربت کے خاتمے اور قدرتی وسائل کے تحفظ کے لیے زراعت پر توجہ مرکوز کی جائے (ڈان، 8 دسمبر، صفحہ 9)۔

III۔ غذائی فصلیں

9 اگست: ایف اے او کے مطابق امریکہ میں خشک سالی کی وجہ سے مکئی کی پیداوار میں کمی سے زرعی اجناس کی قیمتوں میں جولائی کے مہینے میں 23 فیصد اضافہ ہوا (ڈان، 10 اگست، صفحہ 9)۔

IV۔ تجارت

چینی

24 دسمبر: ہندوستانی حکومت نے اس سال بھی چینی کی برآمد کی منظوری دے دی ہے۔ ہندوستان مستقل تین سالوں سے چینی برآمد کررہا ہے، برازیل کے بعد ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا چینی پیدا کرنے والا ملک ہے (ڈان، 25، دسمبر، صفحہ 9)۔

کپاس

2 اگست: انٹرنیشنل کاٹن ایڈوائزری کمیٹی نے ایک بیان میں کہا ہے کہ 12-2011 میں چین کی طرف سے کپاس کی بڑے پیمانے پر خریداری نے کپاس کی قیمتوں کو گرنے سے سنبھالے رکھا۔ 12-2011 میں کپاس کے عالمی اسٹاک میں خاطرخواہ اضافے اور ملز میں اس کے استعمال میں کمی نے کپاس کی عالمی قیمتوں میں کمی کے رجحان میں اضافہ کیا (دی نیوز، 3 اگست، صفحہ 18)۔

10 اگست: امریکہ کے زراعت کے محکمے نے عالمی کاٹن کے ذخائر کی 13-2012 میں غیر معمولی اضافے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس سے دو فیصد سے زیادہ قیمتوں میں کمی کا امکان ہے (دی نیوز، 12 اگست، صفحہ 17)۔

V۔ ڈیری

8 اگست: نیوزی لینڈ میں اپیل کورٹ نے چین کی کمپنی کو ڈیری فارم کے گروپ کو خریدنے سے روکنے کی درخواست کو رد کردیا۔ مقدمہ ملک میں بیرونی کمپنیوں کو زمین دینے کے خلاف بحث ومباحثے کی بنیاد بنا۔ فریقین میں شامل ایک نیوزی لینڈ کے کاروباری گروپ کے علاوہ مقامی ماوری (Maori) آبادی کے گروہ بھی تھے۔ نیوزی لینڈ دنیا کا سب سے بڑا ڈیری کی اشیاء برآمد کرنے والا ملک ہے (دی نیوز، 9 اگست، صفحہ 17)۔

VI۔ ماہی گیری

2 دسمبر: سینٹرل اور پیسفک فشریز کمیشن (Central and Pacific Fisheries Commission) نے منیلا، فلپائن میں ایک کانفرنس کے دوران کہا کہ زیادہ سے زیادہ مچھلی پکڑنے سے ٹونا (tuna) مچھلی کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے جسے تحفظ دینے کی ضرورت کے پیش نظر اس مچھلی کے شکار میں 30 فیصد کمی لانی ہوگی (ڈان، 3 دسمبر، صفحہ 3)۔

VII۔ کارپوریٹ

5 جولائی: جاپان میں پارلیمانی پینل نے ایک نہایت تنقیدی جائزے میں ٹوکیو الیکٹرک پاور کمپنی (TEPCO) جو جاپان کے شمال مشرق میں فوکوشیما ڈایچی (Fukushima Daiichi) نیوکلیئر پاور پلانٹ چلانے کی ذمہ دار تھی پر الزام لگایا ہے کہ پلانٹ میں پچھلے سال کا حادثہ 11 مارچ کی 14 میٹر بلند سونامی کی وجہ سے نہیں بلکہ انسان کا پیدا کردہ تھا جو تحفظ کے مناسب اقدامات نہ لینے کی وجہ سے واقع ہوا (ڈان، 6 جولائی، صفحہ12)۔

14 جولائی: ایک خبر کے مطابق کینیڈا کی ایک چھوٹی کمپنی، اوکاناگن اسپشیلیٹی فروٹس (Okanagan Speciality Fruits) اس کوشش میں ہے کہ وہ ایک جینیاتی طور سے تبدیل شدہ سیب مارکیٹ کرے جو کاٹنے کے بعد بھورا (brown) نہیں ہوتا۔ امریکی سیب کی صنعت اس کو روک رہی ہے۔ اس کے مطابق امریکی 90 کی دہائی سے تیار شدہ جینیاتی اشیاء کھا رہے ہیں لیکن آرکٹک ایپل (Arctic Apple) پہلا جینیاتی طور سے تبدیل شدہ پھل ہوگا جسے لوگ دانتوں سے کاٹ کر براہ راست کھائیں گے (ایکسپریس ٹریبیون، 14 جولائی، صفحہ11)۔

20 اگست: ایک خبر کے مطابق امریکہ میں پچھلے چار مہینوں میں دائر مقدموں میں اس بات کو اجاگر کیا گیا ہے کہ خوراک کی کمپنیاں صارفین کو گمراہ کررہی ہیں کیونکہ امریکی خوراک کے تحفظ کے قانون کو پامال کرتے ہوئے تیار شدہ خوراک کی پیکنگ پر اس میں شامل اشیاء کو ظاہر کرنے سے گریز کررہی ہیں (ایکسپریس ٹریبیون، 20 اگست، صفحہ13)۔

VIII۔ ماحول

4 ستمبر: ایک مضمون کے مطابق 80 فیصد اینٹی بائیوٹیک جو امریکہ میں بکتی ہیں وہ

مرغیوں، سور، گائے اور دیگر جانوروں پر استعمال ہوتی ہیں جنہیں لوگ کھاتے ہیں۔ اس سال امریکی حکومت کی طرف سے یہ خبر بھی آئی کہ وہ جراثیم جو اینٹی بائیوٹیک کے خلاف مدافعت رکھتے ہیں وہ مرغیوں کے سینے کے گوشت میں 10 گنا زیادہ بڑھ چکے ہیں۔ امریکی سائنسدان کہتے ہیں کہ ان کے پاس جانوروں پر استعمال ہونے والی اینٹی بائیوٹیک کے حوالے سے بہت کم معلومات ہیں (ایکسپریس ٹریبیون، 5 ستمبر، صفحہ 7)۔

11 ستمبر: چین میں حکومتی ادارے اس خبر کی جانچ پڑتال کریں گے جس میں کہا گیا ہے کہ چین اور امریکہ کے ایک تحقیقی منصوبے میں چینی بچوں پر جینیاتی طور سے تبدیل کیے گئے چاول سے تجربے ہوئے ہیں۔ گرین پیس (Green Peace) کے مطابق امریکہ کی زراعت کے محکمے نے 24 چینی بچوں پر جینیاتی طور سے تبدیل شدہ چاول جو کہ گولڈن رائس (Golden Rice) کہلاتا ہے استعمال کیا (ایکسپریس ٹریبیون، 12 ستمبر، صفحہ 3)۔

20 ستمبر: فرانسیسی رسالے میں چھپے ایک تحقیقی مقالے میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ چوہوں کو مونسانٹو کمپنی کا تیار کردہ جینیاتی مکئی یا ہربیسائیڈ راؤنڈ آپ دیا جائے تو ان کے جسم میں رسولی (tumor) پیدا ہونے کے علاوہ جسم کے اندرونی اعضاء کو نقصان پہنچتا ہے اور 50 فیصد نر اور 70 مادہ چوہوں میں قبل از وقت موت واقع ہوتی ہے (ایکسپریس ٹریبیون، 21 ستمبر، صفحہ 18)۔

IX۔ موسمی تبدیلی

24 جولائی: امریکی خلائی تحقیقی ادارے NASA (ناسا) کے مطابق گرین لینڈ میں پچھلے 30 سالوں کے مقابلے میں اس مہینے زیادہ بڑے علاقے پر برف پگھلتی نظر آئی (دی نیوز، 25 جولائی، صفحہ 11)۔

9 اگست: امریکہ کے نیشنل کلائمٹ ڈیٹا سینٹر (موسمی مواد کے سینٹر) کے مطابق امریکہ کی 48 ریاستوں میں اس سال جولائی کے مہینے میں گرمی نے 1930 کی دہائی میں قائم ریکارڈ کو توڑ دیا (ڈان، 10 اگست، صفحہ 13)۔

23 اگست: ایک سائنسی ماہر کے مطابق قطب شمالی میں انسان کی پیدا کردہ موسمی تبدیلی کی وجہ سے برف اگست کے مہینے میں اب تک اپنی سب سے کم ترین سطح پر پہنچ گئی ہے (ڈان، 24 اگست، صفحہ 13)۔

4 دسمبر: عالمی بینک نے اپنی ایک رپورٹ میں کہا ہے کہ غریب ممالک کو گرین ہاؤس گیسیز کے اخراج کو روکنے میں جلدی کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ کام صرف امیر ممالک نہیں کر سکتے۔ اگر وہ اپنی آلودگی کو صفر کی سطح پر بھی لے آئیں جو ناممکن ہے تب بھی 2030 تک موسمی تبدیلی کے نقصاندہ اثرات کو روکا نہیں جاسکتا (دی نیوز، 4 دسمبر، صفحہ 17)۔

5 دسمبر: عالمی بینک کی رپورٹ کے مطابق عرب دنیا اور شمالی افریقہ کو موسمی تبدیلی کے بدترین اثرات بھگتنے پڑیں گے۔ گرمی اور خشک سالی زراعت سے سیاحت تک سب کو متاثر کرے گی (دی نیوز، 6 دسمبر، صفحہ 12)۔

5 دسمبر: دوحہ میں دنیا کے غریب ترین ممالک اور وہ جو موسمی تبدیلی سے سب سے زیادہ متاثر ہیں کی میٹنگ میں یورپی یونین نے کہا کہ معاشی حالات کی وجہ سے وہ اقوام متحدہ کی موسمی تبدیلی کی کانفرنس میں امداد کے کوئی نئے وعدے نہیں کرے گا جبکہ امریکہ کا کہنا تھا کہ وہ اپنے تمام کیے ہوئے وعدہ پہلے ہی پورے کر رہا ہے (ڈان، 6 دسمبر، صفحہ 12)۔

7 دسمبر: دوحہ میں اقوام متحدہ کی طرف سے موسمی تبدیلی پر بات چیت آخری دن غریب ممالک کی امداد اور کیوٹو پروٹوکول کو توسیع دینے کے موضوع پر اختلاف کی نظر ہوگئی۔ ترقی یافتہ ممالک کو یہ بتانا ہے کہ وہ 100 بلین ڈالر کی رقم کلائمٹ فنڈ کے لیے کیسے اکٹھا کریں گے (ڈان، 8 دسمبر، صفحہ 8)۔

سبز معیشت:

7 اگست: امریکہ کے ایکسپورٹ امپورٹ بینک کے صدر فریڈ ہوک برگ (Fred Hochberg) نے کہا کہ بینک سبز توانائی کے منصوبوں کے لیے جنوبی افریقہ کے ساتھ دو بلین ڈالر کے معاہدے پر دستخط کرے گا (دی نیوز، 8 اگست، صفحہ 14)۔

6 ستمبر: اپنے ملک میں ''پائیدار ترقی کو فروغ دینے کے لیے روس نے 54 ''سبز اشیاء'' پر درآمدی ڈیوٹی کم کرنے کا اعلان کیا ہے (ڈان، 7 ستمبر، صفحہ 11)۔

7 ستمبر: روس میں شروع ہونے والے ایشیاء- پیسفک ایکانامک کوآپریشن فورم سے پہلے امریکی سرکاری افسر نے کہا کہ ایشیاء پیسفک ممالک نے سبز ٹیکنالوجی کی تجارت کو فروغ دینے میں بڑی پیش رفت کرلی ہے اور امریکہ کوشش کر رہا ہے کہ اس حوالے سے ایک علاقائی فری ٹریڈ زون (یعنی آزاد تجارت پر مبنی علاقہ) تشکیل دیا جائے (ایکسپریس ٹریبیون، 8 ستمبر، صفحہ 14)۔

8 ستمبر: جنوبی کوریا میں قدرتی نظام کی خدمات (ecosystem services) کے موضوع پر ماحول کے تحفظ کی عالمی کانفرنس IUCN (آئی سی یو این) کے زیر انتظام جاری ہے۔ اس میں عالمی بزنس کونسل اہم کردار ادا کر رہا ہے (ایکسپریس ٹریبیون، 5 ستمبر، صفحہ 12)۔

X۔ قدرتی آفات

22 جولائی: پچھلے 60 سالوں میں تیز ترین بارش سے چین کے دارالحکومت بیجنگ میں 37 افراد جان بحق ہوئے (ڈان، 23 جولائی، صفحہ 10)۔

16 جولائی: سالانہ مون سون کی بارشوں سے ہندوستان کی ریاست اسام میں جون سے اب تک 109 افراد کی جانیں جاچکی ہیں اور 400,000 نقل مکانی پر مجبور ہوئے ہیں (ایکسپریس ٹریبیون، 17 جولائی، صفحہ 8)۔

25 جولائی: ایک مضمون کے مطابق امریکہ میں 60 سالوں میں سب سے زیادہ ریاستوں میں پھیلنے والی خشک سالی 29 امریکی ریاستوں کو متاثر کررہی ہے۔ یہ ناصرف کسانوں، فصلوں اور مال مویشی کے لیے خطرہ ہے بلکہ پانی کی کمی کی وجہ سے پاور پلانٹ کے بند ہوجانے کا اندیشہ ہے کیونکہ امریکہ میں توانائی زیادہ تر پانی سے حاصل کی جاتی ہے (ایکسپریس ٹریبیون، 25 جولائی، صفحہ 6)۔

27 جولائی: ایک امدادی پیکج جس کا اعلان واشنگٹن میں کیا گیا کے مطابق خشک سالی سے متاثر امریکی کسانوں کو پانچ بلین ڈالر کی براہ راست ادائیگی کے ذریعے مراعات دی جائے گی (ڈان، 29 جولائی، صفحہ 12)۔

1 اگست: امریکی وفاقی حکومت نے ایک درجن ریاستوں کی 218 کاؤنٹیز (counties) کو خشک سالی کی وجہ سے آفت زدہ علاقہ قرار دے دیا (ڈان، 2 اگست، صفحہ 13)۔

7 اگست: فلپائن کے شہر منیلا میں آدھے سے زیادہ شہر تیز بارشوں کی وجہ سے پانی کے نیچے چلا گیا ہے۔ 250,000 لوگوں کو نقل مکانی کرنی پڑی جبکہ کم از کم 15 لوگ جان بحق ہوئے (دی نیوز، 8 اگست، صفحہ 10)۔

XI۔ مزاحمت

5 جولائی: ایک مضمون کے مطابق چین میں ماحول کے تحفظ کی بڑھتی ہوئی تحریک نے جنوب مشرقی صوبے سچوان (Sichuan) میں دنیا کے سب سے بڑے تانبے کے منصوبے جس پر 1.6 بلین ڈالر خرچ کیے جانے تھے کو بند کروادیا (ایکسپریس ٹریبیون، 5 جولائی، صفحہ 1)۔

پ۔ مختصر تبصرہ

چیلنج میں تین انگریزی اخباروں - ڈان، دی نیوز اور ایکسپریس ٹریبیون - سے زرعی مواد، زرعی مداخل، غربت، غذائی تحفظ، غذائی نقد آور فصلوں، تجارت، مال مویشی، ماہی گیری، پولٹری، ماحول، موسمی تبدیلی، قدرتی بحران اور مزاحمت کے حوالے سے چیدہ چیدہ خبریں اس طرح لی جاتی ہیں کہ عوام ہمارے ملک کے زرعی سیاسی، معاشی ڈھانچے میں ہونے والی اہم ترین پالیسی سازی اور اس پر عمل درآمد کو باریک بینی سے پڑھ پائے۔ یہ خبریں حکومتی یا کسی سرکاری و غیر سرکاری ادارے کی ترجمانی نہیں کرتیں۔ بلکہ جیسے اخبارات میں درج کی جاتی ہیں ویسے ہی اردو ترجمہ کے ساتھ پیش کردی جاتی ہیں۔

ان خبروں کا اگر تجزیہ کیا جائے تو چند باتیں مستقل ابھر کر سامنے آرہی ہیں۔ بہت زیادہ واضح ہے کہ زمین اور پانی جو زراعت کی بنیاد ہیں دونوں پر چھوٹے کسانوں کا اختیار کم سے کم ہوتا چلا جارہا ہے۔ پاکستانی کسانوں کی کثیر تعداد کے پاس زمین ہی نہیں اور جن کے پاس زمین کے حقوق ہیں ان کی پانچ ایکڑ سے کم زمین کل زرعی زمین کی صرف 19 فیصد ہے اور زرعی سینسیز 2010 کے مطابق ان کے کھیتوں (فارمز) کی کل تعداد 64 فیصد ہے۔ دوسرے لفظوں میں گوکہ چھوٹے کسان اکثریت میں ہیں لیکن ان کے پاس کل زرعی زمین کا صرف 19 فیصد حصہ ہے۔ پاکستان میں امنڈتی ہوئی غربت اور ناانصافی کی جڑ زمین کی غیر منصفانہ تقسیم ہے اور اب بڑے پیمانے پر زمین ہتھیانے کا عمل اس ظلم میں مزید شدت پیدا کرتا نظر آرہا ہے۔

بہت سی غیر سرکاری تنظیموں اور کچھ سیاسی پارٹیوں نے زمینی اصلاحات اور جاگیرداری کے خاتمے کا مطالبہ کیا ہے۔ پاکستان کسان مزدور تحریک اور روٹس فار ایکوٹی نے ملک گیر مشاورت کے بعد اس مسئلے کو اپنے منتقی حل تک لے جانے کی کوشش کا آغاز کیا ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ زمین پر صرف اسی کا حق ہے جو اس پر خود کام کرتا ہے۔ پاکستان کی آبادی کی اکثریت دیہات سے تعلق رکھتی ہے اور کسی نہ کسی طرح سے زراعت سے وابستہ ہے لیکن یہی وہ آبادی ہے جو غربت کی چکی میں سب سے زیادہ پس رہی ہے۔ ظاہر یوں کیا جاتا ہے کہ جیسے دولت مند اشرافیہ طبقہ انہیں اپنے ''ٹکڑوں'' پر پالتا ہے۔ ایسا قطعاً نہیں ہے، حقیقت میں مزدور و کسان ہی وہ طبقہ ہے جو اپنی جان مار کر جاگیردار اور سرمایہ دار کو دولت بنا کر دیتا ہے۔ آج زمین کی منصفانہ و مساویانہ تقسیم ہو جائے تو اس ملک کا کسان و مزدور شراکتی طاقت بن کر ملک کے استحکام کا ضامن بن سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اسے پیداواری وسائل پر اختیار حاصل ہوجائے۔

زمین کی مساویانہ تقسیم نہ صرف خوراک اور بھوک کے مسئلے کا حل ہے بلکہ یہ پانی کی قلت کو دور کرنے میں بھی بھرپور کردار ادا کرسکتی ہے۔ آبپاشی کے محکمے اور علاقائی بااثر افراد کا گٹھ جوڑ پانی کی لوٹ مار کی بڑی وجہ ہے جس سے چھوٹا کسان پانی

کی مستقل کمی کا شکار رہتا ہے۔ پانی ضائع نہ کرنے کی ذمہ داری سب کی ہے لیکن یہ پہلے دیکھیں کہ زیادہ پانی کون استعمال کر رہا ہے، زیادہ زمین کس کس کے پاس ہے اور وہاں کیسی زراعت ہورہی ہے؟ کیا صنعتی زراعت میں پانی کا بے دریغ استعمال اور پھر عالمی منڈی کے لیے ضرورت سے زیادہ پیداوار حاصل کرنا ہمارے پانی کے ذخائر پر دباؤ کا باعث نہیں بنتا؟ اب جواب یہ دیا جارہا ہے کہ پانی وہ استعمال کرے گا جس کے پاس اس کو خریدنے کے پیسے ہوں۔ پانی کی نجکاری زور وشور سے کی جارہی ہے۔ کینال واٹر پرائسنگ پالیسی اس قسم کے حل کی طرف ملک کو دھکیل رہی ہے۔ اس بحث میں پڑے بغیر ہم جس حل کو قابل عمل سمجھتے ہیں اسے یہاں بتانا ضروری ہے۔

ہمارے نزدیک چھوٹے کسانوں کی چھوٹے پیمانے پر کاشتکاری جس میں ان کا پہلا مقصد اپنے اور قوم کے لیے صاف ستھری کیمیائی اجزاء سے پاک صحت مند خوراک کی پیداوار ہے جو ملک کو نہ صرف استحکام دے گی بلکہ دیگر ملکی چیلینجوں سے مقابلہ کرنے میں بھی معاون ثابت ہوگی۔ کسان جو طریقہ کاشت سبز انقلاب سے پہلے اپنے بیج، کم پانی، مصنوعی کھاد اور دوا کے بغیر ہزاروں سال سے کرتے تھے وہ اب بھی کرسکتے ہیں۔ خبروں کے ذریعے یہ بات بھی سامنے لائی گئی ہے کہ سری لنکا کے ایک تجرباتی منصوبے سے معلوم ہوا ہے کہ جنوبی ایشیاء اور افریقہ کے کچھ علاقوں میں جہاں کسان اپنے چھوٹے آبپاشی کے منصوبے خود چلاتے ہیں وہاں پیداوار میں 300 فیصد تک اضافہ ممکن ہو جاتا ہے (ایکسپریس ٹریبیون، 21 اگست، صفحہ 11)۔ اس طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جنگلات کا تحفظ سب سے بہتر طریقے سے وہاں کے مقامی لوگ کرسکتے ہیں۔ لہذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مقامی سطح پر لوگوں کو بااختیار اور خودمختار بنا کے ہی پاکستان کو مضبوط بنیادوں پر استحکام مل سکتا ہے اور پائیدار ترقی کے خواب کو کامیابی کے ساتھ پائے تکمیل تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ لیکن اس وقت جو کچھ بھی حکومتی پالیسی کی سطح پر ہورہا ہے وہ ''بات ہے تباہی کی''۔ اس شمارے میں شامل کئی خبریں مسائل کی سنگینی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ صرف اور صرف زرمبادلہ کمانے کے لیے پوری کی پوری زراعت کو آزاد تجارت کی بھینٹ چڑھا دیا گیا ہے تاکہ ملک بڑھتے ہوئے بیرونی قرضوں کی سود کی رقم ادا کرتا رہے۔ آزاد تجارت کے تحت جتنی برآمدات بڑھائی جارہی ہیں ان سے زیادہ درآمدات میں اضافہ ہورہا ہے۔ صرف خوراک کی مد میں درآمدات میں 12-2011 میں 18.24 فیصد اضافہ ہوا۔ بچے ملک میں بھوکوں مر رہے ہیں اور گندم کو برآمد کیا جارہا ہے، پھل آزاد مقابلے کے لیے تیار کیے جارہے ہیں لیکن مغربی منڈی مستقل انہیں غیر معیاری قرار دے کر رد کررہی ہے۔ بڑے زور شور سے ہمارے آم امریکہ پہنچانے کی مہم چلائی گئی لیکن اس سال جہاز کے کرائیوں میں اضافہ اور امریکہ کی طرف سے سخت ترین شرائط کی وجہ سے آم امریکہ برآمد نہیں ہوپائے۔ یہی حال کینو کا رہا، کرائے میں اضافے سے تنگ آکر برآمد کرنے والوں نے حکومت سے مراعات کا مطالبہ کردیا۔ کیا ہمارے ملک میں جانوروں کی کمی ہے؟ پاکستان دودھ فراہم کرنے والے ممالک میں صفحہ اول کے ممالک میں شامل ہے پھر کیوں بحرین سے واپس کردہ بیمار بھیڑیں شدید خطرہ مولتے ہوئے ملک میں لائی گئیں! ہمارے بہترین چاول بھی ہندوستان اور چین کے سستے چاولوں سے مقابلے کے دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ کپاس کی اچھی ملکی پیداوار کا عالمی ریکارڈ پیداوار سے مقابلہ ہے۔ نتیجتاً قیمتوں میں کمی سے کمپنیوں کا ہی فائدہ ہے جنہیں اس مقابلے سے سستے سے سستا مال اپنے کاروباری منافع کے لیے چاہیے اور پسا کون؟ ہمارے جفاکش کسان جنہوں نے بڑی دقت سے قرضہ لے کر مہنگی ترین یوریا، ڈی اے پی اور نہایت خطرناک بی ٹی کپاس کی کاشت کرتے ہوئے، کپاس کی زیادہ سے زیادہ پیداوار ملک کے خزانوں کے لیے تو پیش کردی لیکن آخر میں مشکل سے اپنے لیے دو وقت کی روٹی بھی شاید پوری نہ کرسکے۔ دوسرا رخ دیکھیں: ملک کے اندر اینگرو، فوجی فرٹیلائزر اور دیگر یوریا بنانے والی کمپنیاں ملک میں زیادہ سے زیادہ یوریا بنا کر اپنے منافع کی شرح میں بھاری اضافے ہی کو دیکھتی ہیں، ان کے ماحولیاتی نقصانات اور کسانوں کے مداخل کی بڑھتی ہوئی قیمتوں پر ان کی نظر نہیں جاتی۔ فرٹیلائزر کمپنیوں نے اپنا بے تحاشہ منافع سرعام اخباروں میں چھاپا۔ مونسانٹو اور دیگر بیج کی کمپنیوں نے بھی فخراً اپنے اپنے شیئر ہولڈرز کی تجوریاں بھر ڈالیں۔

اپنے منافع کی راہ میں رکاوٹیں ہٹانے کے لیے ''کمپنی راج'' اب ہمارے گاؤں گوٹھوں تک پہنچ چکا ہے۔ یو ایس ایڈ ہر جگہ اپنی کمپنیوں کے لیے راستہ صاف کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ''عورتوں کو معاشی استحکام'' کا جھانسہ دیتے ہوئے ان سے کارآمد جڑی بوٹیوں کی چنائی کے نام پر بائیوٹیک کمپنیوں کے لیے مزید تنوع حیات تک رسائی ممکن بنائی جارہی ہے۔ دوسری طرف موسمی تبدیلی اور قدرتی بحرانوں نے ہمارے گرد حلقہ تنگ کردیا ہے۔ ان حالات میں ماحولیاتی بحران کو کم کرنے کے لیے اقدامات اٹھانے چاہیں لیکن ہم سبز معیشت کا پرچار کرتے ہوئے غیرملکی ٹیکنالوجی کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔ کیا ہم سستی توانائی علاقائی ممالک یا اپنے ملک کے تھر کے کوئلے کے ذخائر سے حاصل نہیں کرسکتے؟

الغرض جہاں ایک طرف ملکی نجی سرمایہ دار اپنے مفاد کے لیے سرگرم نظر آرہے ہیں تو دوسری طرف غیر ملکی کمپنیاں پیچھے نہیں۔ اس میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ یو ایس ایڈ کی اس سخاوت کا مقصد پاکستان میں ایسے شعبے کی صلاحیت بڑھانا ہے جو کہ کل ان کی بڑی بڑی کمپنیوں کے لیے ''میر جعفر'' کا کردار ادا کرتے ہوئے ملک کے مزید قدرتی وسائل، جن میں خوراک اب پہلے نمبر پر ہے، کو ان کے قبضے میں دے دے۔

ایسے حالات میں ہماری تیاری کس سمت میں جارہی ہے؟ کیا آزاد تجارت کی دیوی ہر چیز کا جواب ہے یا عوامی طاقت اور خود انحصاری، فیصلہ ہمیں بہت جلد کرنا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ماسوائے عوام کی خودمختاری کے اور کوئی راستہ نہیں۔